مئی / جون ۱۹۸۹ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (قسط ۳۰)	مولانا محمد تقی امینی	۴
کاروانِ حدیث (۲)	عبدالرشید عراقی	۱۱
فکرِ اقبال کی روشنی میں ...	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۹
لغات و اعرابِ قرآن (۳)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۵
حضرت ابوبکر صدیقؓ غیروں کی نظر میں	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۷۹
منشورِ اسلام (۱۲)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	۸۵
اہل السنۃ والجماعۃ	محمد سعید الرحمٰن علوی	۹۳
نقطۂ نظر (اسلام اور تصوف)	سید عباس علی	۱۰۵

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا ۔۔۔ کتنا کتنا حصہ ہے

سقوط مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد ۔۔۔ سندھ کیوں جل رہا ہے

پنجابی سندھی کشمکش ۔۔۔ مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اس شر میں کچھ خیر بھی ہے ؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرز عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا ۔۔۔ بے لاگ تجزیہ

اصلاح احوال کے لیے مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا تازہ سلسلہ مضامین

استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر دردمند پاکستانی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

۱۴۴ صفحات، سفید آفسٹ کاغذ، قیمت صرف ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ : ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۵۲۶۸۳

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ
خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی ،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۸ | مئی ۔ جون ۱۹۸۹ء، شوال ۔ ذیقعد ۱۴۰۹ھ | شمارہ ۵-۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری ۔ شاہراہ لیاقت کراچی، فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۔/۴۰ روپے فی شمارہ ۔/۴ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

اس شمارے کی قیمت ۔/۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ کا انعقاد

(۱۸ جولائی تا ۱۰ اگست ۸۹ء)

الحمدللہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جہاں درس و تدریسِ قرآن اور نشر و اشاعتِ علوم و مطالبِ قرآنی کا کام بحسن و خوبی انجام پا رہا ہے، وہاں تعلیم و تعلّمِ قرآن کے ضمن میں قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے منصوبے بھی بحمداللہ کامیابی سے چل رہے ہیں۔ گو قرآن اکیڈمی کی تعلیمی و تحقیقی سرگرمیاں ابھی بہت محدود ہیں اور یہ تعلیمی منصوبہ ابھی خاطر خواہ اندازمیں وسعت پذیر نہیں ہو سکا ہے لیکن قرآن کالج کا منصوبہ اللہ کی تائید و توفیق سے خاصا حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے اور قوی امید ہے کہ قرآن کالج قدیم و جدید علوم کا ایک عمدہ اور قابلِ عمل امتزاج ہی ثابت نہیں ہوگا قرآن اکیڈمی کے لیے نرسری کا کام بھی دے گا۔ اور اگر اللہ نے چاہا تو اس کالج کے گریجویٹس میں سے ہی علومِ قرآنی سے ذہنی و قلبی مناسبت رکھنے والے وہ طلبہ ہمیں حاصل ہوں گے جو قرآن اکیڈمی کے منصوبے کو آگے بڑھائیں گے اور اس تحقیقی و تخلیقی کام کی راہ ہموار ہوگی جس کی ضرورت کے احساس نے کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے تجویز کردہ تعلیمی ادارے 'دارُالارشاد' کی صورت اختیار کی اور کبھی وہ علاّمہ اقبال کے ذہن و تخیّل میں 'دارالسّلام' کی شکل میں جلوہ گر ہوا۔ یہاں اس ناخوشگوار حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے کہ مذکورہ بالا دونوں منصوبوں یعنی 'دارُالارشاد' اور 'دارالسّلام' کی حیثیّت ایک آرزو اور خواب ہی کی رہی اور ان میں سے کوئی بھی تعلیمی منصوبہ بالفعل روبعمل نہ لایا جا سکا لیکن یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے فکری رہنمائی کا سامان اور ایک نقشۂ کار ان کے ذریعے بہرحال فراہم ہو گیا ــــ جس کا اعتراف و اقرار نہ کرنا بلاشبہ حق تلفی اور احسان ناشناسی ہی کے ذیل میں آئے گا۔

پچھلے چند سالوں کے دوران قرآن اکیڈمی میں دیگر طویل المیعاد تعلیمی منصوبوں کے ساتھ ساتھ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ ایسے طلبہ کے لیے جو میٹرک یا ایف اے کے امتحانات سے فراغت کے بعد آئندہ داخلوں کے انتظار میں چند ماہ کے لیے فارغ ہوں، بنیادی دینی تعلیم کا کوئی مختصر المیعاد پروگرام ترتیب دیا جائے تاکہ طلبہ کا یہ فارغ وقت بہتر اور بامقصد انداز میں گزرے۔ اس ضمن میں اس سال قرآن اکیڈمی میں ۱۸ جولائی تا ۱۰ اگست ۸۹ء ایک ۲۴ روزہ اسلامک جنرل نالج ورکشاپ منعقد کی جا رہی ہے۔ اس ورکشاپ کے روزانہ دو دورانیے (SESSIONS) ہوں گے۔ صبح کے سیشن میں جو ۸ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر جاری رہے گا، بنیادی تجوید اور ترجمۂ نماز سکھانے کے ساتھ ساتھ تعارفِ قرآن، تعارفِ حدیث اور سیرت النبیؐ ایسے موضوعات پر مشتمل ایک مختصر نصاب کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ مزید برآں طلبہ کو قرآن کے حکمت و فلسفہ اور دین کے جامع تصور سے متعارف کرانے کے لیے قرآن کے منتخب مقامات کا مطالعہ لیکچرز اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ کرایا جائے گا۔

شام کے اوقات میں عصر تا مغرب ایک خصوصی تربیتی پروگرام ہوگا جس میں تدارسِ اجتماعی (GROUP DISCUSSIONS) کے ذریعے دورِ حاضر کے مسائل خصوصاً امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا جائے گا۔ تاکہ طلبہ کو ملکی و ملّی معاملات پر غور و فکر کی جانب متوجہ کیا جا سکے اور اُن میں علمی نہج پر تبادلۂ خیال اور گفتگو کرنے کی صلاحیت کو اجاگر کیا جا سکے۔ اِس ورکشاپ کے پروگرام کی مزید تفصیلات پراسپکٹس منگوا کر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

واضح رہے کہ اِس نوع کی ورکشاپ سے جہاں ایک جانب مقصود یہ ہے کہ طلبہ کے فارغ وقت کا صحیح اور بہتر مصرف تلاش کیا جائے وہاں ساتھ ہی ہمارے پیشِ نظر یہ بھی ہے کہ ان طلبہ کو جو ایف اے کا امتحان دے چکے ہوں، قرآن کالج سے متعارف بھی کرایا جائے اور قرآن کالج میں داخلے کے لیے اُن کے ذہنوں کو ہموار بھی کیا جائے۔ اسلامک جنرل نالج ورکشاپ کے ذریعے ہماری خواہش ہوگی کہ طلبہ کے اندر دینی علم خصوصاً تحصیلِ قرآن کی چنگاری روشن ہو جائے اور وہ ذوق و شوق اور دلی آمادگی کے ساتھ قرآن کالج میں داخلے کا پروگرام لے کر اِس ورکشاپ سے رخصت ہوں۔ چنانچہ ایسے تمام احباب کے لیے جو اپنے بچوں کو قرآن کالج

(باقی صـ۱۰۴ پر)

مولانا محمد تقی امینی

اُمّتِ مسلمہ کی زندگی کا دستور العمل

اوپر امتِ مسلمہ کی قیادت کا اعلان ہوا تھا۔ اب اس کی زندگی کے لئے "دستور العمل" کا اعلان ہو رہا ہے "دستور العمل" کے باقی رہنے اور اس میں مضبوطی پیدا کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے (۱) عظمت اور (۲) تقدّس۔ عظمت سے دلوں میں اس کا وقار و احترام قائم ہوتا اور برقرار رہتا ہے اور تقدّس (مقدّس ہونا) سے دستور میں خاص قسم کی شانِ دلربائی اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ دونوں زندگی کے کسی دستور العمل سے نکل جائیں تو پھر نہ طبیعت کی کشش اس کی طرف ہوگی اور نہ زندگی میں اس کا اصلی اثر ظاہر ہوگا۔

ان آیتوں میں "دستور العمل" کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس میں انہیں دو باتوں کا ذکر ہے۔ "دستور" کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ تاریخ کی مسلّمہ بڑی شخصیتوں کا نہ صرف یہی زندگی کا دستور رہا ہے بلکہ وہ اپنی اولاد کو بھی اسی کی نصیحت اور وصیّت کرتے رہے ہیں۔ ان بڑوں کا یہ عمل اور تجربہ خود اپنی جگہ دستور کی "عظمت" پر شہادت ہے۔ اس کے مقدّس ہونے کا حال یہ ہے کہ دنیا کے مقدس ترین انسانوں کا یہ دستور العمل رہا ہے جن سے بڑھ کر دنیا نے مقدّس انسان پیدا نہیں کئے ہیں۔ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ان کا عمل اور تجربہ دستور کے مقدّس ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ
اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
(البقرة : ۱۳۰ - ۱۳۴)

"ملّت (دینی طریقۂ زندگی) ابراہیمی سے وہی شخص منہ پھیرتا ہے جو خود ہی بیوقوف ہو۔ ہم نے تو ابراہیمؑ کو دنیا میں بھی چھانٹ لیا تھا اور آخرت میں (بھی) بلاشبہ وہ صالح لوگوں میں سے ہیں جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ (ابراہیمؑ) اسلام لاؤ (اللہ کے آگے جھک جاؤ) تو ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کے آگے جھک گیا ہوں۔ اور اسی بات کی ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے بھی اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لئے یہ دین منتخب کر لیا ہے تم مرتے دم تک اسی پر قائم رہنا اور اسی پر مرنا[ا] (اسلام ہی کی حالت میں مرنا)۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار (مسلمان) ہیں۔ یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں اور تم سے نہیں سوال کیا جائیگا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۲]

[ا] اس جگہ تین لفظ ہیں (۱) ملّت (۲) اسلام اور (۳) دین ۔ تینوں کا مطلب قریب قریب ہی ہے۔ صرف استعمال کے لحاظ سے فرق ہے ۔

ملّت ۔ دینی طریقۂ زندگی اور دستور العمل کو کہتے ہیں ۔ اسلام کے معنی زندگی کے حالات و معاملات میں صرف اللہ کے آگے جھکنا اور اسی کی فرمانبرداری کرنا۔ دین سے مراد زندگی گزارنے

کی وہ بنیادی ہدایتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے طریقۂ زندگی یا دستور العمل (طرز فکر اور طرز عمل دونوں) متعین ہوتا ہے۔

اس طرح امّتِ مسلمہ کی زندگی کا دستور العمل ملّتِ ابراہیمی قرار پایا جس کی بنیاد دین پر قائم ہے اور دین کی حقیقت اسلام (صرف اللہ کے آگے جھکنا) ہے۔ یہاں ملّت، دین اور اسلام کسی کی تفصیل نہیں ہے۔ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ امّتِ مسلمہ کی زندگی کا دستور العمل وہی ملّتِ ابراہیمی ہے جس کے تم (یہود و نصاریٰ وغیرہ) دعوے دار ہو۔ اس کی بنیاد بھی اسی دین پر قائم ہے جو تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا دین تھا اور جس کی حقیقت ہمیشہ اسلام رہی ہے۔ یعنی صرف اللہ کے آگے جھکنا۔ اس اندازِ بیان سے ایک طرف تاریخی تجربہ سے "دستور" کو مضبوط کیا گیا اور دوسری طرف مخالفین کی دشمنت دور کی گئی ہے۔ یہاں دین اور اسلام کے لفظ سے لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے جب کہا جاتا ہے کہ دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوئی یا مذہب سب کا "اسلام" رہا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ "اسلام" کا موجودہ مجموعہ سب کا مذہب رہا ہے یا اسلام اسی شکل و صورت کے ساتھ سب کا "دین" رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس مجموعہ میں ایک بڑا حصہ شریعت کا ہے جس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے جبکہ دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح "اسلام" میں کوئی اختلاف نہیں ہوا جو دین کی حقیقت اور اصل دین ہے۔ (یعنی اللہ کے آگے جھک جانا اور اسی کا فرمانبردار رہنا) اب جو اسلام کا مجموعہ ہے اس کے شریعت والے حصہ میں اختلاف ہوتا رہا ہے، سب کی یکساں شریعت نہیں رہی ہے۔ اس لحاظ سے ملّتِ ابراہیمی میں جس کو دین کہا گیا ہے اس سے مراد ایمان و اعتقاد، عبادت و طاعت، طہارت و پاکی، نیکی و بدی اور پاکیزگی و گندگی کے بارے میں اللہ کی ہدایتیں ہیں جو ہمیشہ یکساں رہی ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کمی بیشی تو ہو سکتی ہے کسی زمانہ میں کچھ کم ہدایتیں آئی ہوں اور کسی میں زیادہ آئی ہوں لیکن ایسا نہیں ہوا کہ کبھی توحید کی ہدایت ہو پھر اس کو بدل کر شرک کر دیا گیا ہو۔ کبھی اللہ کی عبادت و طاعت کا حکم ہو پھر کسی اللہ کے غیر کو اس میں شامل کر لیا گیا ہو کبھی ایک چیز کو پاک، پھر ناپاک قرار دیا گیا ہو۔ کبھی نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی، پاکیزگی کو گندگی اور گندگی کو پاکیزگی قرار دیا گیا ہو۔

اسی طرح ملّت ابراہیمی ؑ جس کو "اسلام" کہا گیا ہے اس سے مراد اللہ کی ہدایتوں میں اُسی کے آگے جھکنا اور اُسی کا فرمانبردار رہنا ہے۔ وہ ساری تفصیلات مراد نہیں ہیں جو اسلام کے نام سے موجود ہیں۔

اللہ کی انہی ہدایتوں پر شریعت کی عمارت تیار ہوتی اور اس کی شکل وصورت متعین کی جاتی ہے جس میں حالات و زمانہ اور قومی مزاج کی رعایت سے تبدیلی ہوتی رہی ہے (دین و شریعت کی بحث کہیں اپنے موقع پر آئے گی)۔

ایسے ہی جب کہا جاتا ہے کہ تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملّت پر ہو تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دین کی جو ہدایتیں ان کو دی گئی تھیں وہی تمہیں دی گئی ہیں اور اللہ کے آگے جھکنا اور ہدایتوں کا فرمانبردار رہنا جو ان کا طریقہ رہا ہے وہی تمہارا بھی ہے۔

۲؎ ملّت ابراہیمی یا اُمّتِ مسلمہ کے دستور العمل کا امتیاز (ا) خالص اللہ کی عبادت (ب) خالص اللہ کی اطاعت اور (ج) اور ہر ایک پر اس کے عمل کی ذمّہ داری ہے۔ باپ دادا کی عظمت و ان کا تقدس اپنی جگہ ہے لیکن کوئی کسی کے عمل کا ذمّہ دار نہیں ہے ہر ایک کو اپنا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ یہ خیال غلط ہے کہ کسی کے آباء و اجداد کی بزرگی اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔

اُمتِ مسلمہ کے دستور العمل کا اصلی رنگ

دستور العمل کا اصلی رنگ اقرار ہے انکار نہیں ہے تصدیق ہے تکذیب نہیں ہے اتحاد ہے اختلاف نہیں ہے یہ وہی رنگ ہے جو شروع سے اللہ کے دین کا رہا ہے اور سب کو دیا گیا ہے۔ لیکن دین کے دعویداروں نے اس کی حقیقت گم کر دی ہے اور فرقہ بندی و گروہ بندی کے رنگ میں اپنے کو رنگ لیا ہے جس میں اپنے سوا سب کا انکار ہے اپنے سوا سب کی تکذیب ہے اور اپنے سوا سب سے اختلاف ہے۔ فرقہ بندی و گروہ بندی کا یہ رنگ کسی قوم و جماعت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ گراوٹ و پستی کے زمانہ میں ہر قوم و جماعت اس میں مبتلا ہوتی اور دین و مذہب کے نام

پر جو کچھ اور جس شکل میں اس کے پاس ہوتا ہے اسی کو سب کچھ سمجھتی ہے اسکے علاوہ کسی اور کو خاطر میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھتی ہے ان آیتوں میں اصلی رنگ دکھایا گیا ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ۝ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ۝ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (البقرہ آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱)

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ (نہیں) بلکہ ہم تو ابراہیمؑ کی ملت پر ہیں جو یک سو ہو کر خالص اللہ کی طرف تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہمارے اوپر اتارا گیا اور جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم اسکے

رسولوں میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہیں اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔ اگر وہ بھی (اسی طرح) ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پا گئے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہی ہٹ دھرمی پر ہیں۔ آپ کے لیے اللہ ان سے کافی ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے؟ اور ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں[۲] آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں اور ہم تو اسی کے مخلص ہیں۔ یا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو گواہی چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے[۳] وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی، انکے لیے انکے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں اور تم سے انکے بارے میں پوچھا نہ جائیگا[۴]"

[۱] یہود و نصاریٰ بھی پہلے ملّت ابراہیمی پر تھے جس میں شرک کی گنجائش نہ تھی اور اسی سے ان کو ہدایت ملی تھی اب بھی اسی میں ہدایت ہے یہود و نصاریٰ بننے میں ہدایت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی ملّت یا ملّت ابراہیمی پر قائم نہیں ہیں۔

قرآن میں کئی جگہ حضرت ابراہیمؑ کی صفت "حنیف" آئی ہے جس کا مطلب وہ شخص ہے جو ادھر ادھر مائل نہ ہو اور یک سو ہو کر خالص اللہ کا فرمانبردار رہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اس پر گواہ ہے کہ قوم، وطن، خاندان، آل اولاد اور خود اپنی ذات کی اللہ کے حکم کے مقابلہ میں کبھی پرواہ نہ کی

[۲] اللہ کا رنگ یہ ہے کہ اللہ نے جتنے پیغمبر بھیجے اور جتنی کتابیں اتاریں ان سب پر ایمان لایا جائے۔ کسی پر ایمان اور کسی کا انکار یہ اللہ کا رنگ نہیں ہے بلکہ فرقہ بندی و گروہ بندی کا رنگ ہے۔ یہودی اس بات سے تو خوش تھے کہ مسلمان حضرت موسیٰؑ پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس بات سے ناخوش تھے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان لاتے ہیں اسی طرح عیسائی اس بات سے خوش تھے کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ

پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس بات سے ناخوش تھے کہ وہ حضرت موسیٰؑ پر بھی ایمان لاتے ہیں۔

اللہ نے دنیا میں بیشمار پیغمبر بندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے ان میں بعض کا ذکر موجود ہے اور بہت سوں کا ذکر نہیں ہے لیکن سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان کا ذکر ہو یا نہ ہو جن کا ذکر نہیں ہے ان کی پیغمبری کو پہچاننے کا طریقہ ان کی زندگی اور ان کی تعلیم ہے پیغمبروں کی زندگی جیسی صاف ستھری اور آزمائش کی گذرتی ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے پیغمبروں کی بنیادی تعلیم میں یکسانیت ہوتی ہے اس میں فرق نہیں ہوتا ہے اس تعلیم کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے اگر ان دونوں کسوٹی پر کسی کی زندگی اور تعلیم پوری اترتی ہو تو اسکو پیغمبر تسلیم کرنا چاہیے اگرچہ اسکا ذکر نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ حضرتِ انبیاء علیہم السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ یہ فرقے ان کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ نے ان کے یہودی اور نصرانی نہ ہونے کے دو جواب دیئے ہیں ایک عوام کو کہ ان حضراتؑ کے بارے میں تمھیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو ہے تم تو اسوقت تھے بھی نہیں کہ کوئی بات دیکھ کر کہہ سکتے؟ چارو ناچار تمھیں اللہ ہی پر زیادہ بھروسہ کرنا ہوگا۔ دوسرا علماء کو کہ تم ایسے مقام پر ہو کہ حق بات کی گواہی اللہ نے تمھارے سپرد کی ہے لیکن تم حق بات کے مقابلہ میں فرقہ اور گروہ کو ترجیح دے رہے ہو اور گواہی چھپانے کے مجرم بنے ہوئے ہو، حالانکہ وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جو اللہ کی طرف سے سپرد کی ہوئی حق بات کی گواہی چھپائے۔

فرقہ و گروہ کے مقابلہ میں حق بات چھپانے اور حق کی گواہی نہ دینے کی بات کسی قوم کے علماء کے ساتھ خاص نہیں ہے بگڑی ہوئی قوموں کے علماء میں عام طور سے پائی جاتی ہے مسلمانوں کے علماء میں تو اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

یہ آیت الٰہی اوپر گزر چکی ہے۔ بات کو ذہن میں بٹھانے کے لیے اگرچہ تکرار مفید ہے لیکن یہاں تکرار ماننے کی ضرورت نہیں ہے، اوپر یہود و نصاریٰ کی طرف گفتگو کا رخ تھا ان سے یہ بات کہی گئی تھی یہاں مسلمانوں کی طرف گفتگو کا رخ ہے ان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ بڑوں کی بڑائی اپنی جگہ ہے لیکن کوئی کسی کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہے ہر ایک کو اپنا بوجھ اٹھانا پڑیگا۔

(جاری ہے)

عبدالرشید عراقی

محدثین کرام کی علمی خدمات

امام احمد بن حنبلؒ 241ھ

امام احمد بن حنبل جن کی کنیت ابو عبداللہ تھی 164ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ 1۔ اور 77 سال کی عمر میں 12 ربیع الاول 241ھ بغداد ہی میں وفات پائی۔ 2۔ ابتدائی تعلیم بغداد کے محدثین کرام سے حاصل کی۔ اور بعد میں تحصیل حدیث کے لئے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ وہاں کے اساطین فن سے استفادہ کیا۔ 3۔ امام محمد بن ادریس شافعی (م 204ھ کا نام بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔ ان سے آپ نے اجتہاد کے اصول سیکھے اور موطا امام مالک کا سماع کیا4۔

40 سال کی عمر میں حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انہوں نے عمر کے 40 ویں سال جو سن نبوت ہے علوم نبوت کی اشاعت شروع کی۔ 5۔

امام احمد بن حنبل کے فضل و کمال، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور تبحر علمی کا ان کے معاصرین، تلامذہ اور اساتذہ نے اعتراف کیا ہے۔

امام شافعی (م 204ھ) فرماتے ہیں۔

خرجت من بغداد ما خلفت بها اتقی ولا افقه من احمد بن حنبل 6۔

میں بغداد کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے زیادہ علم و فضل والا، اور متقی اور فقیہ کوئی نہیں۔

امام احمد بن حنبل زہد و توکل میں یکتائے روزگار تھے، انہوں نے کبھی سلاطین زمانہ اور خلفاء کا عطیہ قبول نہیں فرمایا۔ مسئلہ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم

اسلام ان ؒ شہرت سے معمور تھا۔ ہر طرف ان کی تعریف اور دعا کا غلغلہ تھا۔ اور اس کا ثبوت اس وقت ہوا کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کے جنازہ میں 8 لاکھ مردوں اور 60 ہزار عورتوں نے شرکت کی۔ 7۔

مسند احمد امام احمد بن حنبل کی مشہور تصنیف ہے۔ اور اس کا شمار حدیث کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ 172 اجزاء پر مشتمل ہے اور 7 سو صحابہ کرام کی مرویات پر مشتمل ہے اور احادیث کی تعداد 40 ہزار ہے۔ جن میں 30 ہزار احادیث اور 10 ہزار کے قریب زوائد ہیں 8۔

مسند احمد کا شمار ان امہات الکتب میں ہوتا ہے جن پر ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے۔ اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ و استفادہ کیا ہے۔ مسند احمد بن حنبل صحیحین کے بعد تمام کتب حدیث میں سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ ہے 9۔ اور علمائے کرام نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

> اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و بہتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہئے 10۔

امام دارمی (م 255ھ)

امام ابو محمد عبداللہ دارمی 181ھ میں سمرقند میں پیدا ہوئے 11۔ اور 75 سال کی عمر میں 255ھ میں سمرقند ہی میں وفات پائی۔ 12۔ امام صاحب کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے اور امام صاحب کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ ائمہ صحاح ستہ میں سوائے امام ابن ماجہ (م 273ھ) کے باقی سب محدثین صحاح آپ کے شاگرد ہیں 13۔ تحصیل حدیث کے لئے آپ نے شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کے سفر کئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م 123ھ) لکھتے ہیں۔

> امام صاحب رحلت و اسفارت اکثر بلاد اسلام را گشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ 14۔
>
> امام صاحب کثرت سے سفر کیا کرتے تھے، اکثر بلاد اسلام کا سفر کیا اور دور دراز شہروں میں گشت کر کے علم حدیث کو جمع کیا۔

امام دارمی کو قدرت نے حفظ وضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ ارباب سیر اور محدثین کرام نے ان کے حفظ وضبط، عدالت وثقاہت اور تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔

خطیب بغدادی (م463ھ) لکھتے ہیں کہ

امام دارمی ان علمائے اسلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک تھے جو احادیث کے حفظ وجمع کے لئے مشہور ہیں 15۔

سنن دارمی امام صاحب کی مشہور تصنیف ہے۔ صحاح ستہ کے بعد جو اہم اور مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں ان میں سنن دارمی بھی شامل ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م1052ھ) فرماتے ہیں

کتاب او از احسن کتب حدیث است 16۔

کتب حدیث میں سنن دارمی ایک اچھی کتاب ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح جو منتخب حدیثوں کا مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری مستند ومعتبر کتابوں کی طرح سنن دارمی کی احادیث بھی اس میں شامل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1176ھ) نے سنن دارمی کو کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے 17۔ سنن دارمی کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں 18۔

امام دارمی نے عام کتب حدیث وسنن کے برعکس اس کی ابتداء باب ما کان علیه الناس قبل بعث النبی صلی الله علیه وسلم من الجهل والضلالة

سے کی ہے۔ اس کے بعد مختلف ابواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف وخصائص کو جو کتب قدیم میں مذکور ہیں کو بیان کیا ہے اس کے بعد آپ کے معجزات، فضائل وحمائد، اتباع سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا ہے اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

سنن دارمی پہلی دفعہ برصغیر میں 1293ھ میں محی السنۃ امیر الملک حضرت مولانا سید نواب صدیق حسن خان قنوجی رئیس بھوپال (م1307ھ) کی سعی وکوشش سے مولانا

عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے مطبع نظامی کان پور سے چھپوا کر شائع کی۔ 19۔

امام بخاریؒ (م256ھ)

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری جن کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب امیر المومنین فی الحدیث تھا، 194ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے اور 256ھ میں 63 سال کی عمر میں قریہ خرتنگ میں مضافات سمرقند انتقال کیا20۔

16 سال کی عمر میں امام وکیع (م197ھ) اور امام عبداللہ بن مبارک (م181ھ) کی کتابوں کو حفظ کیا (210ھ) میں تحصیل حدیث کے لئے سفر کا آغاز کیا۔ مصر، شام، جزیرہ، حجاز مقدس، کوفہ و بغداد اور بصرہ کا سفر کیا21۔ اور بغداد کا سفر آپ نے 8 مرتبہ کیا۔ اور ہر مرتبہ امام احمد بن حنبل ان کے بغداد کے قیام پر اصرار کرتے تھے22۔ امام صاحب کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ ارکان صحاح میں امام مسلم (م261ھ) امام ترمذی (م279ھ) اور امام نسائی (م303ھ) ان کے شاگرد ہیں۔ امام ابن خزیمہ (م311ھ) امام محمد بن نصر مروزی (م294ھ) اور امام ابو حاتم رازی (م277ھ) بھی آپ کے تلامذہ میں سے ہیں 23۔

امام بخاری کا حافظہ اور استحضار اس غضب کا تھا کہ معاصرین ائمہ اس کو ایک کرامت سمجھتے تھے24۔

آپ کے تبحر علمی، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور فضل و کمال کا اعتراف آپ کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین نے کیا ہے۔ حافظ ابن حجر (852ھ) فرماتے ہیں کہ امام بخاری کی مدح و تعریف و توصیف میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کئے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے۔

فذلک بحر لا ساحل لہ 25۔

ع سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے۔

الجامع الصحیح البخاری یہ امام صاحب کی مہتم بالشان تصنیف ہے اور صحیح بخاری کے نام سے معروف ہے اس کا پورا نام الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ ہے۔ اس کتاب کو امام صاحب نے 16 سال میں مدینہ منورہ میں مکمل کیا26۔

صحیح بخاری کے محاسن و فضائل بے شمار ہیں جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن صلاح (م463ھ) صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کتابا هما اصح الکتب بعد کتاب الله العزیز ثم ان
کتاب البخاری اصح الکتابین صحیحا واکثرهمافوائد
27۔

یعنی کتاب اللہ کے بعد ان دونوں کتابوں کا درجہ ہے پھر صحیح بخاری کا مرتبہ صحت اور اکثرت فوائد کے لحاظ سے ممتاز و مقدم ہے۔

حافظ ابن کثیر (774ھ) لکھتے ہیں کہ "صحیح بخاری کا صحیح مسلم یا اور کوئی کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی"۔ 28۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م1176ھ) نے صحیح بخاری کو طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے 29۔ اور اس کے ساتھ فرماتے ہیں۔

جو شخص اس کتاب کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مبتدع ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے 30۔

الجامع الصحیح البخاری کے جلیل القدر اور معقول ہونے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ سلف سے لے کر خلف تک علمائے اسلام نے اس کی خدمت کی ہے۔ صاحب سیرۃ البخاری مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ) نے عربی، فارسی اور اردو میں ۱۴۳ شروح کا ذکر کیا ہے ۳۱۔

بخاری کے شارحین میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین اور علمائے کرام شامل ہیں مثلاً! امام خطابی صاحب معالم السنن (م ۳۰۸ھ)، حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)۔ علامہ بدر الدین یمنی (855ھ)، امام یحییٰ بن شرف نووی (م676ھ) امام خطیب قسطلانی (م923ھ)، محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م1307ھ)

علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (م1352ھ)، علامہ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م1073ھ) مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م1338ھ)

امام مسلم (م 261ھ)

امام مسلم بن حجاج جن کی کنیت ابوالحسین اور عساکر الدین لقب تھا، 204ھ میں خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ 32؎ اور 261ھ میں 55 سال کی عمر میں نیشاپور ہی میں انتقال کیا 33؎ امام صاحب نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو آپ کا مولد و مسکن نیشاپور علم و ادب کا مرکز اور محدثین کرام کا پایہ تخت تھا۔

علامہ ابن سبکی (م 771ھ) لکھتے ہیں۔

فقد کانت نیشابور من اجل البلاد و اعظمها لم یکن بعد بغداد مثلها 34؎

نیشاپور اس قدر بڑے اور عظیم شہروں میں تھا کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہ تھی۔

ابتدائی تعلیم نیشاپور میں حاصل کی بعد ازاں تحصیل حدیث کے لئے عراق، حجاز اور شام کا سفر کیا۔ امام بخاری (م 256ھ) کو آپ کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور امام ابو حاتم رازی (م 277ھ) اور امام ابو زرعہ (م 264ھ) جیسے نامور محدثین کرام کو آپ کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

امام مسلم کے فضل و کمال، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور تبحر علمی کا اعتراف آپ کے اساتذہ، تلامذہ، اور معاصرین نے کیا ہے۔ علامہ ذہبی (م 748ھ) نے امام اسحاق بن راہویہ (م 238ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ای رجل یکون هذا 35؎

خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہو گا۔

الجامع الصحیح المسلم آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ اور اس کتاب کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا نام ہمیشہ صحیح بخاری کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ امام صاحب نے یہ کتاب 15 سال میں مکمل کی 36؎ امام مسلم نے اس کتاب میں ان احادیث کو درج کیا ہے جن کی صحت پر مشائخ وقت کا اتفاق تھا۔

صحیح مسلم میں سب سے زیادہ قابل ذکر اس کا مقدمہ ہے۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو جرح و تعدیل اور اصول حدیث سے متعلق نہایت مہتم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں اور

دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں اس کو مرتب کیا۔ اس میں کس قدر موضوع روایات رواج پا گئی تھیں' اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا۔

علامہ نووی (م676ھ) فرماتے ہیں۔

امت نے ان دونوں کتابوں (بخاری و مسلم) کی تلقی بالقبول کی ہے البتہ صحیح بخاری اور دیگر فوائد و معارف کے لحاظ سے سب سے فائق و ممتاز ہے۔ 37؎

علامہ شبیر احمد عثمانی 1369ھ) نے مقدمہ فتح الملہم میں علامہ ابن اثیر جزری (م631ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

یعنی صحیح بخاری کا امام مسلم کی کتاب پر من حیث الصحۃ راجح و متقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے بحث مکرر کے بعد کیا ہے۔ 38؎

محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م1307ھ) لکھتے ہیں

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے کیونکہ امام بخاری و مسلم اپنے زمانے اور بعد کے ائمہ حدیث پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت و تمیز میں بھی سب پر مقدم و فائق ہیں۔ 39؎

صحیح بخاری کی طرح صحیح مسلم کے ساتھ بھی علمائے کرام نے اعتنا کیا ہے۔ اس کے بہت سے شروح' مستخرجات و حواشی لکھنے والوں میں امام نووی (م676ھ) قاضی عیاض مالکی (م544ھ) علامہ سیوطی (م911ھ) حافظ عبدالعظیم قندری (م656ھ) محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م1307ھ)' علامہ شبیر احمد عثمانی (م1369ھ) اور مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م1338ھ) شامل ہیں۔

1؎ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج10ص326

2؎ حافظ عبدالرحمان بن علی جوزی صفوۃ الصفوۃ ج2ص191

3؎ ابن سبکی طبقات الشافعیہ ج1ص201

4؎ سیوطی تدریب الرادی ص34

5۔ ابو زہرہ نضری 'حیات امام احمد بن حنبل ص34
6۔ ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ ج2ص18
7۔ احمد بن خلکان 'وفیات الاعیان ج1ص48
8۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی 'بستان المحدثین ص30
9۔ ضیاءالدین اصلاحی 'تذکرۃ المحدثین ج1ص147
10۔ عبدالرحمان مبارک پوری 'مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص90
11۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج5ص294 خطیب بغدادی' تاریخ بغداد ج1ص29'
12۔ ابن حجر 'تہذیب التہذیب ج 5ص 295
13۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی 'بستان المحدثین ص28
14۔ خطیب بغدادی تاریخ بغداد ج10ص29
15۔ عبدالحق محدث دہلوی اکمال شرح مشکوۃ ص12
16۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ ج1ص107
17۔ ضیاءالدین اصلاحی 'تذکرۃ المحدثین ج1ص196
18۔ ابن حجر 'مقدمہ فتح الباری ص455'
19۔ خطیب بغدادی تاریخ بغداد ج2ص34
20۔ ابن حجر 'مقدمہ فتح الباری ص479
21۔ ابن کثیر 'البدایہ والنہایہ ج11ص26
22۔ نووی 'تہذیب الاسماء واللغات ص173 ذہبی تذکرۃ الحفاظ ج2ص159
23۔ تقی الدین ندوی 'محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے ص141
24۔ ابن حجر 'مقدمہ فتح الباری ص485
25۔ ابن حجر 'مقدمہ فتح الباری ص491
حافظ ابن صلاح 'مقدمہ ابن صلاح ص
26۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج11ص28
27'28۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' حجۃ اللہ البالغہ ج1ص297
29۔ عبدالسلام مبارک پوری 'سیرت البخاری ص206تا249
30۔ ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ ج2ص165
31۔ احمد بن خلکان 'وفیات الاعیان ج2ص136

(باقی صفحہ ۸۴ پر)

ع بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش!

فکرِ اقبال

کی روشنی میں

حالاتِ حاضرہ

اور

ہماری قومی ذمّہ داریاں

خطاب بہ مجلسِ اقبال

الحمرا آڈیٹوریم ——— ۲۱ اپریل ۸۶ء

از

اسرار احمد

امیرِ تنظیم اسلامی و صدر مؤسّس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

احمدہٗ واصلّی علیٰ رسولہ الکریم

امّابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربّ اشرح لی صدری ○ ویسّرلی امری ○ واحلل عقدۃ من لسانی ○

یفقھوا قولی ○

محترم و مکرّم صدرِ مجلس!

محترم اراکین و کارکنان مرکزیہ مجلسِ اقبالؔ لاہور،

اور معزّز خواتین و حضرات!

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار ع "بیا بہ مجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش" کے مصداق مجلسِ اقبالؔ میں شرکت و شمولیّت کی سعادت حاصل ہو چکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس بندۂ ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا گیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ واقعۃً میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ملک نصر اللہ خاں عزیزؔ مرحوم کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں کہ ع "اِک بندۂ عاصی کی ——— اور اتنی مدارتیں ———!"

مجھے آج صبح ہی کی فلائٹ سے 'شامِ الہُدیٰ' کے مستقل پروگرام کے لیے کراچی روانہ ہو جانا تھا لیکن مجلسِ اقبالؔ میں شرکت کی سعادت کے لیے یہ ادنیٰ سا تردّد تو ہرگز کوئی قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ایئرپورٹ اور ایئرپورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی پہنچوں ——— البتّہ منتظمینِ مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور

پر میری شمولیّت کے لیے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا ــــ اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدّت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہو جانا ہوگا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اعلم و افضل اصحابِ علم و فضل کے افکار و خیالات سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ بہرحال "مالا یُدرکُ کلّہٗ لایُترکُ کلّہٗ" کے مصداق جو میسّر آ گیا ہے غنیمت ہے!

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ میں اپنی روایت کے یکسر خلاف آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار 'مجلسِ اقبال' کے لیے بھی ایک موضوع تجویز کر دیا گیا ہے یعنی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں" اور یہ موضوع اوّلاً تو خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے ــــ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی رواروی میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ رہ جائے! ــــ پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور من و عن شائع ہوں لہٰذا "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ" کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے "حالاتِ حاضرہ" کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو اُن کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ:۔

"God has given us a golden opportunity to prove our worth as architects of a new nation and let it not be said that we did'nt prove equal to the task".

اپنی نااہلی اور عدم قابلیّت کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اُن کے قائم کردہ پاکستان کو تو آج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ سال قبل دولخت کرالیا تھا ——— اب اندیشہ یہ ہے کہ مفکرِ و مصوّرِ پاکستان علاّمہ اقبالؔ نے ۱۹۳۰ء میں جس پاکستان کا خواب

"An independent Muslim State at least in the North-West of India".

کی صُورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اُسے بھی اپنی نااہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں! اور اس طرح برّصغیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی جمیلہ اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہو جائیں! ——— اس لیے کہ ایک طرف ع "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری!" کے مصداق تا حال 'بے آئینی' ہی سرزمین پاکستان کا 'آئین' ہے گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیس سال پُورے کر چکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک کی ستائیسویں کو یہ چالیس سال پُورے ہو جائیں گے!) ہم ؎ "چہل سالِ عمرِ عزیزت گذشت مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت"

کے مصداق سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز 'نابالغ' ہیں! ——— تو دوسری طرف ——— صاف نظر آتا ہے کہ ع "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف" ——— اور ؎ "چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں!"

کے مصداق اس قافلۂ ملّی کی کوئی منزلِ معیّن ہے ہی نہیں! اور یہ "ہجومِ مومنیں" بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ ؎ کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں اے ہجومِ نا اُمیدی دل بہت گھبراتے ہے!

چنانچہ اغیار طعنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چُست کر رہے ہیں، مبصّرین اور تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION) اور حصّے بخرے ہو جانے

(BALKANISATION) کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کر دیا جائے۔!

گویا، نظر بظاہر، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بددلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان سے جھانک کر واقعات کی دنیا میں "حالاتِ حاضرہ" کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

ایک جانب سیاچین گلیشر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن آئے دن کی بھارتی جارحیت سے خون آلود ہوتی رہتی ہے۔ پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حساس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں جاتا جب بھارتی زعما میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہراتا ہو۔ نتیجۃً پاکستان سے بھارت کی پیدائشی دشمنی اور مستقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر مستزاد یہ فوری اور شدید اندیشہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کسی بڑی جارحیت کا ارتکاب نہ کر گذرے!

دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستزاد روس کی ننگی اور براہِ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان، افغانستان اور روسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلّق ترازو سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی امید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ

پون صدی قبل کے الفاظ کہ ؎

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دِلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

حقیقت و واقعیت کا رُوپ دھار لیں اور یہ خطّہ ایک وحدت کی صُورت اختیار کر کے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بن جائے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبیریا کا برفانی ریچھ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لیے آخری دَوڑ کا آغاز کر دے اور خاکم بدہن، پاکستان بھی اُس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے!

داخلی محاذ پر ——— پاکستان کی ماں اور معمارِ پاکستان اور مصوّر و مفکرِ پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جو ان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے قبل واقعتہً صرف نوابوں اور نواب زادوں، اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتہ ۳۵ء اور ۴۷ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صُورت اختیار کر گئی تھی عرصہ ہوا کہ ع "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کی مصداقِ کامل بن چکی ہے۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اُس کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے اور غیر جماعتی انتخابات میں اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیبل چسپاں کر کے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اُس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی سطح پر اُس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیّت۔

اس طرح بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ، سے قطع نظر ——— قومی سیاست کے میدان میں انتہائی بائیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گروہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ ببانگِ دہل سامنے آچکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اہم نام صرف خان عبدالغفار خاں اور جی ایم سیّد کے ہیں البتہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گروہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم تر نام این ڈی پی، پی این پی، اور سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ کے ہیں! ——— تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرۂ اثر

صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدائے بازگشت جناب حنیف رامے کی صورت میں سامنے آئی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں، جن کی اکثریت واضح طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابلِ ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی، جے یو پی اور جماعتِ اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی بائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے ——— یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقاؤ استحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اوّلاً اس بنا پر کہ ان کا دائرۂ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں مختصر ٹکڑوں (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی، اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدرِ مشترک کے باوجود اُن کی باہمی آویزش بلکہ چپقلش ضربُ المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے، وہ کوئی فیصلہ کُن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیماکریسی یا سوشل ڈیماکریسی کے رُخ پر بہہ رہا ہے جس میں یُوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریکِ استقلال کا ——— لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی، اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مدّاحوں اور حامیوں، اور عاشقوں اور جان نثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور سرِ دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعادت کس کے حصّے میں آتی ہے ——— گویا

دیکھیے! اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنسہ بے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلاوطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی ——— اور شہرِ اقبال لاہور میں ورود ———

اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور حد درجہ والہانہ استقبال، اور پھر پاکستان کے دل پنجاب، اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں اُن کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم الشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اُمڈی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجہ میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک و ملّت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ مجلس اقبالؒ بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمّہ داریوں" کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ہماری قومی اور عوامی سیاست کے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی لہر حال ہی میں اُمڈی ہے اُس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی حبس کا ردِّ عمل ہے اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ع "چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی"۔ لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصّہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیّت (PHENOMENON) کی اہمیّت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک و ملّت کے مخلصوں اور بہی خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے ——— اس لیے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجھلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں، وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرزِ عمل اور MIS-HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں!

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس درمیانی دھارے اور اس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرتِ علامہ نے اُس تہذیبِ حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اور اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ــــ اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں: ایک[1] اس کی اصل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اصل اساس ہے، 'خطبات' میں حضرت علامہ نے اسے 'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے ــ اور اسے خالص قرآنی الاصل گویا صد فی صد اسلامی قرار دیا ہے۔ یعنی الفاظِ قرآنی: "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا" (بنی اسرائیل: ۳۶) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کی بنیاد نہ تو توہمات پر قائم کی جائے نہ نرے ہوائی تخیلات پر بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے۔ حضرتِ علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور حد درجہ اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک[1] جانب مظاہرِ قدرت کو آیاتِ الٰہیہ کا تقدس عطا فرمایا[2] اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹیفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا[2] اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تنگنائیوں سے نکال کر

---

[1] سورۃ البقرۃ: آیت ۱۶۴ [2] سورۃ الغاشیہ آیات: ۱۷ تا ۲۰

استقرار کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا ——— اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے میدان ہموار کیا۔ چنانچہ یہی چیز یورپ میں تحریکِ احیاءِ علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر جا پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ :-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

حضرت علّامہ کی یہ ژرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اُس سے قطع نظر میرے لیے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ "انّ اللہ یرفع بھذا الکتٰب اقواماً ویضع بہٖ اٰخرین"۔ "اب اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو ابھارے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) باعث قوموں کو گرائے گا!" گویا مغربی تہذیب بھی جو اُبھری تو لقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے اُبھری! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرانے کے بعد خود اُسے ترک کر دیا گویا :-

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر   اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور   خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ   در بغل داری کتابِ زندۂ

۲۔ تہذیبِ حاضر کا دوسرا جزو اُس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنہیں خطبات میں تو حضرت علامہ نے صرف ایک لفظ 'DAZZLING EXTERIOR' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبال کے تتبّع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہرِ خارجی کے بھی دو رُخ ہیں جنہیں کہیں تو حضرتِ علامہ "چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر" کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں، کہیں ان کی نشاندہی ع "طبِّ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری" جیسے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں ——— اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور انداز یہ ہے کہ :-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و خوشنما اور دل کش و مرغوب کُن مظاہر خارجی میں سے مثلاً ایک حرّیتِ فکر ہے جس کے پردے میں یا باضابطہ کُفر و الحاد ہے یا لاادریت و ارتیابیت اور ان دونوں کا حاصل ہے یا عریاں لامذہبیّت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی ہوئی لادینیت! ——— گویا ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

دوسرے حرّیتِ عمل ہے جس کی شکّر والی تہہ کے نیچے مضمر ہے اباحیت اور آوارگی کا زہر، جس نے اخلاق و کردار اور شرافت و انسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے، تیسرے نمبر پر ہے حرّیتِ نسواں اور نظریۂ مساواتِ مرد و زن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدّس ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور　　کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اور　　کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟　　مرد بے کار و زن تہی آغوش!

اسی طرح ؎ "خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج　　تا ثریّا می رود دیوار کج!"

کے مصداق اجتماعیاتِ انسانیہ کے ضمن میں تہذیبِ مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات کے حسین عنوانوں سے انسان کو اوّلاً لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کا تحفہ دیا جو "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر" کا مصداقِ کامل ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریت عوام پر مسلّط ہو گئی ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور اس کے بعد اِس نہلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مارا جس نے انسان سے اُس کی آزادی کو کُلّیۃً سلب کر کے اُسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ فاعتبروا

آگے بڑھنے سے قبل، اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے:

ایک یہ کہ تہذیبِ جدید کے اس المیے کا اصل سبب سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کی روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے "عِلمُ الاَسماء" پر تو پوری توجّہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخ انسانی کے دوران مسلسل بروز و ظہور اور صعود و ارتقاء کے ذریعے 'علم الاشیاء' اور 'علم الخواص' کے راستے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی ——— لیکن اُس علمِ وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن 'ہدایت' (فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ)[1] سے تعبیر کرتا ہے۔ نتیجۃً اُس نے اُس 'دجّال' کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی حروف میں "ک ف ر" لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اب یہ یک چشم عفریت نوعِ انسانی ہی نہیں ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلّی تباہی پر تُلا کھڑا ہے!

دوسرے یہ کہ عالمِ اسلام میں اس تہذیب کے ضمن میں یہ متوازن نقطۂ نظر میری محدود معلومات کی حد تک، سوائے علامّہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، اور اُن کے بعد اُن کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیّت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکر میں اس توازن کا عکس کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم و مغفور! ——— ورنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے، یا انتہا پسندی اور یک رخاپن! — اور بحیثیّتِ مجموعی بھی ملّت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکلیہ رَد کر دیا۔ نتیجۃً اس کے اُس INNER CORE سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرآنی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف آسمانی ہدایت کے امین بن کر قالَ اللہ اور قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔

---

[1] البقرۃ: ۳۸

اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیبِ مغرب کو من وعن قبول کر لیا۔ نتیجۃً اس کے 'INNER CORE' کے ساتھ ساتھ اس کی "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" سے پیدا شدہ "صنّاعی" کو بھی ایک شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جوں کا توں قبول کر لیا۔ نتیجہ وہ نکلا جسے کسی صاحبِ درد نے یوں بیان کیا کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر — تم نے اسلاف کی عزّت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض — اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اُس بندۂ قلندر پر جس نے کمال انصاف کا ثبوت دیا جب ملّت کے ان دو اہم طبقات کے تضادِ عمل کو یوں واضح کیا کہ ؎

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے — تہہ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

فکرِ اقبالؔ کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانی دھارے اور اُس کی حالیہ مہیب لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں، چنانچہ اس کا بھی ایک 'INNER CORE' ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی، اور نہ افکار و نظریاتِ اقبال کے منافی ہے، نہ تصوّراتِ قائدِ اعظم کی نقیض بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصوّر و مفکّر اور مؤسّس و معمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیّت اور اس کی قوّت و شوکت کا راز مضمر ہے، البتّہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مُشرکانہ بھی ہے اور ملحدانہ بھی! اور یہ بات نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزا کو علیٰحدہ علیٰحدہ پہچان لیا جائے اور دونوں کے ساتھ ایک طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے علیٰحدہ علیٰحدہ رویّہ اختیار کیا جائے!

اس دھارے اور لہر کی 'INNER CORE' کے اجزائے ترکیبی میں سے اوّلین

جزو ہے۔ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ . . . الآیہ" کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و تکریم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، اور اونچ اور نیچ کے جملہ امتیازات کا مکمّل خاتمہ اور انسانوں کے مابین اس سماجی و معاشرتی سطح پر کامل مساوات! بفحوائے الفاظ قرآنی: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (الحجرات:۱۳) اور بقول اقبالؔ

کُلُّ مومن اخوۃٌ، اندر دلش — حرّیت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ! — در نہادِ اُو مساوات آمدہ!

ان امتیازات کا کلّی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرّۂ امتیاز ہے جس کے سامنے ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ اسلام اور شاتمِ رسولؐ بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد مسلمان معاشرے میں ناپید ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں علاّمہ اقبالؔ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ ؎ "یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو، — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!" —— میں اُن کی رُوح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ ؏ "تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ 'انسان' بھی ہو!"

اس 'INNER CORE' کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق (یعنی —— CIVIL RIGHTS) اور اُن کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات! جس سے "تمیزِ بندہ و آقا" کا مکمّل خاتمہ ہو جائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکمران ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالادستی کا حق جتائے، بلکہ نوعِ انسانی "كونوا عباد الله اخوانا" (الحدیث) پر عمل پیرا ہو جائے۔ (ترجمہ) تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ! —— حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ اقدس اور جسمِ اطہر کو بھی قصاص کے لیے پیش فرما کر حضرت

عمرؓ نے بھرے مجمع میں احتساب پر برافروختہ نہ ہوکر بلکہ بالفعل جوابدہی فرماکر، اور حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدّعی کی حیثیت سے پیش ہوکر اور اپنے دعوے کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہوکر جو اعلیٰ و روشن اور ابدی و لازوال مثالیں قائم کی تھیں وہ آج متفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو ACHIEVE اور REALISE کرنے کے لیئے علاّمہ اقبالؔ کے ان پُرشکوہ الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو　　زانکہ از خاکش بروید آرزو!

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است!

لیکن چونکہ وہ نُورِ نبوّت سے براہِ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا افراط و تفریط کے دھکوں کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ——— تاہم کون نہیں جانتا کہ آج ان اقدارِ عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں ——— اور اِسی کا ردِّ عمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے!

اس 'INNER CORE' کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور کم از کم مواقع کی حد تک کامل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال اور 'سرمایہ داری' کی لعنت کا مکمّل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمّہ! ——— یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلامِ پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے حواریین و خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کر کے دکھائیں چنانچہ "كَيْلَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ" کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور "وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا" کے مطابق حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ: اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا

بھی بھوکا مرجائے تو اس کے لیے اللہ کے یہاں عمرؓ ذمّہ دار ہوگا!" اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقبالؔ نے یُوں تعبیر فرمایا کہ:

؎ کس نباشد در جہاں محتاجِ کس — نقطۂ شرعِ مبیں این است و بس

اور آب و نانِ ماست از یک مائدہ — دُودۂ آدم "کنفسِ واحدہ"

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رُخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامّہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

نتیجتاً —— قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداقِ کامل بن ہی چکی ہے کہ ؎

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجُو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا!

خود مذہبیت کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام و حلال ذرائع سے دولت سمیٹو البتہ کچھ صدقہ و خیرات کے کھاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سُود دے کر اُس میں سے زکوٰۃ وصول کر لینے کا تماشا تو حال ہی میں ہُوا ہے۔ 'سُود لو اور اُس میں سے زکوٰۃ دے دو'، پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔

اِس سلسلے میں نقد کے ضمن میں 'ربا النسیئہ' اور 'ربا الفضل' کی جو بے شمار صورتیں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ہماری پوری تجارت و صنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع و ترقی کی جملہ سکیموں میں رچی بسی ہوئی ہیں اُن کا ذکر تو تحصیلِ حاصل ہے، اگرچہ حضرتِ علامّہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! — کس نداند لذّتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ، دِل چوں خشت و سنگ | آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

تاہم 'زمین کے سُود' کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اُس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے موجود ہیں ہی شیدائیانِ اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک لہک کر پڑھتے ہیں[1] کہ:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا، فکر و عمل کا انقلاب | پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور۔ دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں | تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

اور۔ رزق خود را از زمیں بردن روا ست | ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است!

لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبال کی اس تبیین کو صرف اخلاقی وعظ کے خانے میں رکھا ہوا ہے، اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی و فقہی نظام کی اہم اساس ہے! چنانچہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ اور امام دار الہجرت مالکؒ دونوں کا متفقہ فتویٰ ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبال کا یہ فرمانا محض شاعری نہیں ہے کہ

خدا آں ملتے را سروری داد | کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت

بہ آں قومے سروکارے ندارد | کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کر کے دینِ حق کے کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ و قائم کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے خاتم النبیّین اور سیّد المرسلین، محمد الامین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم! ـــــ (بفحوائے الفاظِ قرآنی "وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ" (الشوریٰ: ۱۵) اور "لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (الحدید: ۲۵) اور ع "خدایا آں کرم بارِ دگر کن"! کے مصداق

---

[1] ع "مرا یاراں غزلخوانے شمردند"

اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامّت اور مصوّرِ پاکستان علامّہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

چنانچہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے نقطۂ عروج کا مظہر اُن کی دوسری نظمیں خصوصاً ذوق و شوق ہیں وہاں اُمّتِ مسلمہ کے نام اُن کے پیغام کا مظہرِ اتم و اکمل ہے 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' اور خصوصاً اُس کے یہ آخری اشعار: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

چنانچہ اُس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ع "جوہر دریائے قرآں سفتہ ام" کے مصداق قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کی دل نشیں پیرائے اور شعری اسلوب میں تعبیر و تعلیم میں اپنی توانائیاں کھپا دیں بلکہ ساتھ ہی 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ـــــ کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے اُن کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ ؎

ہر کسے از ظنِّ خود شد یارِ من　　وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

مزید برآں ـــــ یہی تھی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قوم اور بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمّد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ "ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطّۂ ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصولِ حُرّیّت و اخوّت و مساوات کا عہدِ حاضر میں

عملی اور مثالی نمونہ پیش کرسکیں "۔ اور کبھی یہ فرما کر کہ " اسلام ایک سوشل ڈیماکریسی ہے"!

(روایات بالمعنیٰ !)

لیکن افسوس کہ علاّمہ اقبال تو خالص 'مسنون عمر' میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، قائدِ اعظم مرحوم بھی قیامِ پاکستان کے بعد کُل ایک سال زندہ رہے ——— اور اُن کے بعد اُن کی عوامی تحریک کا ثمرہ اُچک لیا، اوّلاً نوابوں اور نوابزادوں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے' اور بعدازاں اس میں مستقل حصّہ دار تو بن گئے کچھ نئے اور پُرانے سرمایہ دار اور باری باری حِصّہ بٹاتے رہے اعلیٰ سِول اور فوجی عہدہ دار! جس کے نتیجے میں قانونِ قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساسِ محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا ——— اور اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسی احساسِ محرومی کی پُرزور ترجمانی کی تھی، ——— ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اُس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہو کر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوانِ اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح رہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیّت سے کوئی بحث ہے نہ اُن کی سیرت و کردار سے' اور نہ اُن کے خلوص یا عدمِ اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے' نہ اُن کی اہلیت یا نااہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی دھارے کے اُس 'INNER CORE' کی تعیین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اِس میں وہ قوّت و مقاومت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء سے بھی اُس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرا پس منظر میں جاتے ہی اُس کی طوفانی لہر سامنے آگئی ——— اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار اس پر سواری بھٹّو مرحوم کی صاحبزادی

مس بے نظیر کرتی ہیں یا اُن کے سابق رفیقِ کار مسٹر جتوئی، یا اُن کی ایک نظر بندی کے دوران اُن کے خلا کو پُر کرنے والے ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان ——— یا کوئی اور!!

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لاء کے بس میں ہے نہ پانچویں کے، اور اس کے آگے نہ علماء کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ مشائخ عظام، نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں نہ نَو دولتیے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اِس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیردار ——— اور نہ کوئی میراس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے نہ کوئی پیر ——— زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے!

اِس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ 'ڈان' بھی خالص مادّیت ہی کے رُخ پر بہہ رہا ہے اور اس کے 'INNER CORE' کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی براہِ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسولؐ سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتنا رہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہٰذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصورات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور اُن کے ضمن میں افراط و تفریط کی انتہاؤں کے مابین بھٹکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چربہ ہے ——— مزید برآں اِن کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عُریانی بھی، اباحیت (PERMISSIVENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور بڑکیں بھی، بھنگڑہ بھی ہے اور "ہے جما لو" بھی ——— اور اِن سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، اُن کا استہزا و تمسخر ہے، شریعت سے بے پرواہی ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائرِ اسلامی کا عدمِ احترام ہی نہیں اُن کی باضابطہ توہین و تذلیل ہے ——— وقس علیٰ ذٰلک!

فکرِ اقبال کی روشنی میں اس صورتِ حال کا علاج بھی اس کی کُلّی نفی

(TOTAL REJECTION) اور بحیثیت مجموعی ردّ کر دینے (TOTAL NEGATION)
میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جزو کو قبول کرتے ہوئے غلط جزو کی اصلاح میں مضمر ہے!

بالکل ایسے جیسے حضرتِ علاّمہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو ؎

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے ؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

گویا نیام تو اپنی جگہ درست اور کار آمد ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی جائے اسی طرح علمِ جدید میں فی نفسہٖ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاعِ بے بہا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس میں خالقِ کائنات کی معرفت و محبت کی چاشنی گھول دی جائے!

یہی وجہ ہے کہ حضرتِ علاّمہ نے اپنے اُس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ:

"MARXISM + GOD = ISLAM"

مغرب کے مادّی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادّیت اور اس کے بھی نقطۂ عروج یعنی مارکسزم تک کو بالکلیہ ردّ نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا تریاق شامل کر دیا جائے تو اس کی سمّیت اور زہرناکی ختم ہو جائے گی اور یہ اسلام کے بہت قریب آ جائے گا!

بنابریں فکرِ اقبال کی روشنی میں اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ پاکستان کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لاحاصل ہی نہیں حد درجہ مُضر اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان و یقین کی چاشنی اور حکمت و معرفت کی روشنی شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رُخ کو آسمانی ہدایت کی جانب موڑ دیا جائے!

اور یہ کام، ظاہر ہے کہ، ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقّت طلب ہے، البتہ

اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں وہ لوگ جو اقبالؔ کے مدّاح و شیدائی اور اُن کے فکر و فلسفہ اور حکمت و بصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو اُن کی جانب منسوب کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ اقبالؔ کے متذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن بباطن حد درجہ محکم فارمولا یہ بھی ہے کہ:

> 'پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور احیاءِ اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدیدِ ایمان اور ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دورِ حاضر میں احیاءِ قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال!'

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبالؔ پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا ——— اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبیین اور تشریح و توضیح کی ہے صرف ——— اور صرف اقبالؔ نے!

لیکن اس کے لیے اقبالؔ کے مدّاحوں اور شیدائیوں کو ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!" کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا، اور حلقۂ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ شدّتِ احساس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مزارِ اقبالؔ کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبالؔ کی "خانقاہ" سے بھی باہر نکل کر "رسمِ شبیری" ادا کرنی ہوگی! اور اس کے لیے اُنہیں اُس ہمّت و جرأت، محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ، جو کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لازمی و لابدی ہیں، حسبِ ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔

۱۔ اوّلاً جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا، اور اگر

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں گا کہ اقبال کے مدّاحوں اور شیدائیوں کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرتِ علاّمہ نے اپنی بے عملی اور 'تن آسانی' کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیّت سے برملا اعتراف کیا اور اُسے کبھی سند کی حیثیّت سے پیش نہیں فرمایا، اُن کے فکر کے علوّ و عظمت کے پیشِ نظر اُن کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیّت نہیں رہتی بلکہ بلا مبالغہ مجھ ایسے لاکھوں انسانوں کا 'عمل' اُن کی 'بے عملی' پر نچھاور کیا جا سکتا ہے ——— لیکن دوسرا کون ہے جو اس کا مدّعی بن کر سامنے آسکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرتِ علاّمہ کو صُوفیا کے 'ملامتیہ' گروہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اُس قاعدہ کلّیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم اُن کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرتِ علاّمہ ہمیں وہ فکر دے گئے جو اس دَور کے لاکھوں نہیں کروڑوں 'باعمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو عملاً بروئے کار لانے کا اوّلین تقاضا ع "شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!" کے مصداق اُس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علاّمہ نے یوں فرمائی کہ ع "عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار!"

اس ضمن میں اس مغالطے پر مستزاد جس تضاد کا مظاہرہ علاّمہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اُس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لیے نہیں رکھتے کہ علاّمہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھروں میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علاّمہ کے افکار و آرا بھی نہایت واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور اُن کا عمل تو اُس سے بھی کہیں زیادہ روشن و تابناک ہے! اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ اِس دَور میں حضرتِ علاّمہ کے اس شعر کا مصداقِ کامل میں ہوں کہ:

؎ کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند!

تاہم یہ صرف ایک مثال ہے۔ ؎ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

۲۔ ثانیاً اس عظیم مقصد کے لیے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے

اور اس ضمن میں حضرتِ علامّہ کی اُن تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی اُن پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی مُلّا پر چُست کی ہیں اُن کے اس طرزِ عمل کو نگاہ میں رکھا جاتے کہ انہوں نے ہمیشہ علماءِ حق کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبۂ علمی و فکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالب علمانہ انداز میں کسبِ فیض میں کبھی اپنی توہین یا سبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامّہ سیّد سلیمان ندویؒ کے ساتھ اُن کی خط و کتابت اس پر شاہد عادل ہے۔

خصوصاً فقہ و قانونِ اسلامی کے ضمن میں اس دَور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باوجود، انہوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہد مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا، قرآن اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمتِ دین اُن کے ذہن و فکر کی جزوِ لاینفک تھی اور تفقّہ فی الدّین اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا ——— قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تن تنہا اس کے اہل ہیں، بلکہ کسے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ دینوی کے آخری ایّام تک بیہقیٔ وقت مولانا سیّد محمّد انور شاہ کاشمیریؒ سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہو جائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوششیں کریں۔

اِس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرتِ علامّہ کو تھی اُسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامّہ نے انہیں دکّن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُن کے تمکّن کی سبیل پیدا فرمائی ——— مجھے حضرت علامّہ کے اِس اقدام

کا پس منظر نظر آتا ہے اُن کے اس قطعے میں جو آج بھی اُن کے مرقد کی زینت بنا ہوا ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امّت بسازیم　　قمارِ زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر مسجدِ شہر　　ولے در سینۂ مُلّا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برّصغیر کے مسلمانوں کی قومی جدّوجہد کے نقطۂ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی کہ 'مَیں مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں' ——— لیکن قیامِ پاکستان کے بعد 'اسلام کے کام' کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کر لیا۔ اس پر تو اس وقت مَیں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کاش کہ ایسا نہ ہوتا! اور مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریقِ کار ہی پر عمل پیرا رہتے، تاہم فکرِ اقبالؔ کے شیدائیوں کی توجّہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیّت حضرت علاّمہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے! اور قدیم و جدید کے محکم امتزاج اور علماءِ حق کے تعاون و اشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رُخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جملہ شرکاءِ مجلس سے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ کارکنانِ مرکزیہ مجلسِ اقبالؔ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے 'مجلسِ اقبال' میں شرکت کی دعوت دے کر میرا اعزاز و اکرام بھی فرمایا ——— اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ اپنا دردِ دل ایسے منتخبِ روزگار حضرات کی محفل میں بیان کر سکوں اور آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اُس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدّت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ساتھیوں کو بھی ہمّت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کر لیا۔ اگر ہم سے کوئی خیر بن آئے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اور خطا ہوتی ہے تو وہ ہمارے نفوس کی شرارت سے۔ اقول قولی ھٰذا واستغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلۂ اقبالیات میں "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی مصداق کامل
قرار دیا جاسکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

عنوانات: مصوّرِ پاکستان ، قافلۂ ملّی کا حدی خواں
رومیٔ ثانی ، عظمتِ قرآن کا نشاں
واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن ——— اور
داعی الی القرآن

نیا ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ
عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، ٹیلی فون: ۸۵۶۰۰۴

لغات و اعرابِ قرآن (۳)

پروفیسر حافظ احمد یار

اِستِعاذہ

قرآنِ کریم کی تلاوت سے پہلے ــــ اور بعض کے نزدیک آخر پر بھی ــــ شیطانِ مردود کے شر اور اس کی وسوسہ انگیزیوں [جسے قرآنِ کریم میں ــ "همزات الشیاطین" اور "شرّ الوسواس الخنّاس" بھی کہا گیا ہے] سے بچنے کے لئے اللہ عزّ وجلّ کی پناہ اور حفاظت طلب کرنا ضروری ہے ــ اور انسان ــــ اپنی کمزوریوں کی بنا پر ــــ اس پناہ اور حفاظت کا سخت محتاج ہے ــ خود قرآنِ کریم نے اس ــ طلبِ پناہ ــ کا حکم دیا ہے (النحل:۹۸) قاریوں اور دیگر اہلِ علم میں یہ پناہ طلب کرنے کے لئے مختلف الفاظ اور متعدد صیغے رائج ہیں۔ لیکن سب سے عام اور زیادہ مستعمل عبارت " اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم" ہے۔ اس پوری عبارت کا نام یا عنوان " استعاذہ " ہے جس کے لغوی معنی ہیں " پناہ طلب کرنا" اور اصطلاحی معنی ہیں " اللہ کی پناہ طلب کرنا " اور اسی لئے ہم مختصراً اسے " اعوذ باللہ" ہی کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں تلاوت کے وقت " استعاذہ " کا حکم تو موجود ہے مگر اس کے لئے کوئی خاص عبارت مقرر نہیں کی گئی اور اس لحاظ سے ہمارے استعاذہ کے یہ الفاظ (" اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ") قرآنِ کریم کی کوئی آیت نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ قرآن کریم کے شروع میں لکھے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی ابتداء تو " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " سے ہوتی ہے ــ یہی وجہ ہے کہ کتبِ تفسیر اور کتبِ اعراب القرآن میں بعض مفسّرین اور نحویوں نے

اپنی کتاب کا آغاز "استعاذہ" پر بحث کے ساتھ کیا ہے۔ جب کہ دیگر بعض نے اپنی کتاب کی ابتداء "بسم اللہ" پر بحث سے کی ہے اور استعاذہ کی بحث کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مقدم الذکر میں طبری، طبرسی، ابن کثیر، مغنیہ، عکبری، ابن خالویہ اور محی الدین الدرویش شامل ہیں۔ جب کہ مؤخر الذکر میں زمخشری، رازی، آلوسی، قاسمی، طنطاوی، بیضاوی، رشیدضا، المراغی، دروزہ، مکی بن طالب اور ابن الانباری کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنی کتاب کا آغاز "استعاذہ" پر بحث سے کرتے ہیں اس لئے کہ تلاوت سے پہلے اس کا پڑھنا کم از کم بھی "سنتِ عین" ضرور ہے بلکہ قرآن کا حکم ہونے کی بنا پر اسے "واجب" بھی کہا گیا ہے۔ لہٰذا پہلے اس کے معنی جاننا بھی ضروری ہے۔ اور اس غرض کے لئے ہم استعاذہ کا عام معروف صیغہ لیتے ہیں یعنی اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔

تاہم اس تمہیدی بحث کو کتاب کے لئے مجوزہ "قطعہ سازی" (PARAGRAPHING) میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی باقاعدہ ابتداء ان شاء اللہ سورۃ الفاتحہ سے ہوگی۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ
(الحج - آیت ۳۷)
اللہ تک تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔
قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ!
عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر قربانی کے ساتھ
قربانی کی رُوح اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف
عیدُ الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی
کا مطالعہ ضرور کیجئے
• سفید کاغذ • رنگین سرورق • ۴۸ صفحات • قیمت صرف چار روپے
قریبی بکسٹال سے خریدیے یا ہم سے منگوائیے!
مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶ - K ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

اللغــة

[اَعُوْذُ] کا مادّہ " ع و ذ " (اجوف واوی) ہے۔ اس صیغے کا وزن اصلی " اَفْعُلُ " ہے جو تعلیل کے بعد " اَفُوْلُ " رہ گیا ہے۔ اس کی شکل اصلی " اَعْوُذُ " ہے۔
اس مادّے سے فعل ثلاثی مجرّد عَاذَ يَعُوْذُ مَعَاذًا (باب نصر سے) آتا ہے۔ (جو دراصل عَوَذَ يَعْوُذُ مَعْوَذًا تھا) اور اس کے معنی ہیں (کسی سے اپنی) حفاظت طلب کرنا، (کسی کی) پناہ لینا یا پناہ مانگنا۔ یہ فعل متعدی ہے اور اس کے ساتھ ہمیشہ "با" کا صلہ آتا ہے جو مکسور (بِ) ہوتا ہے۔ یعنی "عاذ بہ" کہتے ہیں، "عاذہ" کہنا غلط ہے۔ اس میں "بِ" کے بعد اس کا ذکر ہوتا ہے جس کی پناہ مطلوب ہو۔ اور جس شخص یا چیز یا برائی کے مقابلے پر یہ حفاظت اور پناہ درکار ہو، اس کا ذکر اس کے بعد اس طرح کیا جاتا ہے کہ: — (۱) اگر وہ کوئی اسم ہو تو اسے مِنْ ...... کے بعد لاتے ہیں اور (۲) اگر وہ کوئی فعل ہو تو اسے صرف اَنْ ..... کے بعد لاتے ہیں جس سے پہلے مِنْ محذوف یعنی خود بخود موجود (UNDER STOOD) سمجھا جاتا ہے (یعنی "مِنْ اَنْ")۔
اسم کی مثال استعاذہ کا یہی صیغہ ہے اور فعل کی ایک مثال " اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ " (البقرہ: ۶۷) ہے جس کی وضاحت اپنی جگہ آئے گی۔
اس فعل کے استعمال کی صورت یوں ہوگی۔ اَعُوْذُ بِ.... (۱) ..... مِنْ..... (۲)...... یا اَعُوْذُ بِ..... (۱) ..... اَنْ ..... (۲) ...... یعنی میں پناہ طلب کرتا ہوں (۱) کی (۲) کے مقابلے پر یا (۲) سے بچنے کے لئے۔

"اَعُوْذُ" اسی فعل ثلاثی مجرد سے مضارع معروف واحد متکلم کا صیغہ ہے جس کا لفظی ترجمہ ہوگا "میں پناہ مانگتا/مانگتی ہوں"۔ یہ لفظ (اَعُوْذُ) قرآن کریم میں سات (۷) دفعہ آیا ہے۔ فعل ثلاثی مجرّد کے بعض دوسرے صیغوں مثلاً "عُذْتُ"، "یَعُوْذُوْنَ" اور مصدر "مَعَاذ" کے علاوہ بابِ افعال اور استفعال سے بھی اس کے "مضارع" اور "امر" کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

[باللّٰہ] دراصل "بِ + اللّٰہ" ہے۔ اس میں "با" حرف الجر ہے جو اسماء کے شروع میں ہمیشہ مکسور (بِ) ہی آتا ہے۔ اور بطور حرف الجر ہونے کے بھی اس (بِ) کے متعدد معنی ہیں۔ عموماً یہ الصاق یا مصاحبت، استعانت، سببیت، تعویض، بدل، ظرفیت اور قسم کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا اردو ترجمہ حسبِ موقع (علی الترتیب) "..... کے ساتھ، ..... کے ذریعے یا کی مدد سے، ..... کی بناء پر، کی وجہ سے یا کے سبب سے، ..... کے بدلے، ..... کی بجائے، ..... کے پاس سے، ..... کے وقت اور ..... کی قسم ہے" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کئی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

کبھی یہ (بِ) بعض دوسرے حروف جارہ مثلاً لام (لِ)، فِی، عَن، مِن، علیٰ، اِلیٰ اور مَعَ کی بجائے اور ان کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خود قرآن کریم میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ان مواقع کا بھی اپنی اپنی جگہ ذکر آئے گا۔

کبھی یہ (بِ) عربی زبان کے محاورے میں اس طرح بھی استعمال ہوتا ہے کہ وہاں اس کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے مگر پوری ترکیب کو ایک خاص معنی دے دیتا ہے۔ مثلاً "وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ ....." یا "کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا" کی قسم کی تراکیب میں۔ ــــ ان پر بھی بحث اپنے اپنے موقع پر ہوگی۔

کبھی یہ (بِ) مختلف افعال کے ساتھ بطور "صلہ" لگ کر متعدد اور متنوع معنی پیدا کرتا ہے۔ زیادہ تر یہ تعدیہ کے لئے یعنی فعل متعدی کے ساتھ آتا ہے اور اکثر فعل لازم کو تعدیہ دینے (متعدی بنانے) کا کام دیتا ہے۔ یہ سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر

ہمارے مطالعہ میں آئیں گی۔ (اِنْ شَاءَ اللّٰہ)

یہاں (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ میں) یہ (بِ) فعل "عَاذَ یَعُوْذُ" کے صلے کے طور پر آیا ہے جیسا کہ ابھی اوپر "اَعُوْذُ" کی بحث میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس جگہ (استعاذہ میں) "بِاللّٰہ" کا ترجمہ "اللّٰہ سے، اللّٰہ کے ساتھ، اللّٰہ کے ذریعے یا اللّٰہ کی مدد سے" (جو بذاتِ خود درست ہیں) کی بجائے "اللّٰہ کی" کے ساتھ کرنا اردو محاورے کے لحاظ سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس ترکیبِ جملہ (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کے مزید بامحاورہ تراجم آگے چل کر آیات میں اس کے استعمال پر سامنے آئیں گے[1]

اسمِ جلالت (اللّٰہ) جو یہاں "باللّٰہ" میں آیا ہے ـــــ کی لغوی وضاحت آگے "بِسْمِ اللّٰہ" میں آرہی ہے۔

[مِنَ الشَّیْطٰنِ] جو دراصل مِنْ + اَلشَّیْطٰن ہے۔ اس میں "مِنْ" حرف الجر ہے اور اس کے بھی متعدد معنی ہیں۔ موقعِ استعمال کے لحاظ سے اردو میں اس کا ترجمہ .....سے، .....سے لے کر (.....تک)، میں سے، .....کی قسم سے، .....کی نسبت، .....کی بجائے، .....کا بنا ہوا، .....کے مقابلے پر، اور کبھی "جیسا کہ" سے بھی ہو سکتا ہے ـــ "مِنْ" کے مختلف استعمالات پر مزید بحث ابھی آگے چل کر سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں آئے گی۔ "مِنْ" کو آگے کسی لفظ (مثلاً کسی معرّف باللّام) کے ساتھ ملاتے وقت اس کے نون کو ہمیشہ فتحہ (ـَـ) دی جاتی ہے۔ اس وقت اسے "مِنَ" پڑھا جاتا ہے۔

[اَلشَّیْطٰنِ] یہ لفظ جو عام عربی املاء میں "شیطان" لکھا جاتا ہے اتنا معروف لفظ ہے کہ اس کا اردو میں کسی اور طرح ترجمہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس

---

[1] "بِ" کے مختلف استعمالات کی تفصیل اور مثالوں کے لئے کسی اچھی عربی معجم (ڈکشنری) میں "ب کی پٹی" کے شروع میں دیکھ لیجئے۔ نحو کی کتابوں میں حروف المعانی کے ضمن میں بھی اس پر بحث ملے گی اور ـــ افعال کے ساتھ بطور صلہ استعمال کی مثالیں قرآن کریم میں بھی بکثرت آئیں گی۔

نہیں ہوتی۔ صرف اردو، فارسی اور پنجابی ہی نہیں، دنیا کی متعدد اسلامی زبانوں میں یہ جانا پہچانا اور عام مستعمل لفظ ہے، حتیٰ کہ انگریزی میں بھی SATAN یا SATANIC وغیرہ کی تراکیب متعارف ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر "ابلیس" (جس پر بحث اپنی جگہ آئے گی) کے لقب یا صفاتی نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ ایک خاص شریر، سرکش اور بدروح یا شخصیت کا نام ہے۔ اسی لئے محاورے میں ہر متمرد، سرکش، سراپا بدی یا شر کو بھی شیطان کہتے ہیں، چاہے وہ انسان ہو یا جن یا حیوان۔ اور قرآن کریم میں بھی متعدد جگہ پر یہ لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے تاہم صرف ان ہی میں نہیں۔

یہ لفظ بصیغہ واحد معرف باللام (الشیطٰن) قرآن کریم میں ستّر کے قریب مقامات پر اور بصیغہ واحد نکرہ (شیطٰن) چھ جگہ آیا ہے اور ان میں سے اکثر جگہ پر یہ "ابلیس" ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور بصیغہ جمع [شیاطین] یہ لفظ قرآن کریم میں کل اٹھارہ جگہ (کہیں معرفہ کہیں نکرہ) آیا ہے ـــ واحد نکرہ اور جمع (معرفہ یا نکرہ) کی صورت میں یہ دوسرے معنی (یعنی متمرد، سرکش وغیرہ) میں ہی مستعمل ہوا ہے۔

اس لفظ (شیطان) کے مادّہ اور وزن کی بات ـــ اپنے طریق کار کے مطابق ـــ شروع میں ہی کرنا تھی ـــ مگر یہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کے مادّہ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں ـــ اور اس کی تفصیل یوں ہے۔

پہلا قول: اکثر اہلِ لغت کے نزدیک لفظ "شیطان" کا مادہ "ش ط ن" اور وزن "فَیْعَال" ہے۔ اس مادّے سے فعل ثلاثی مجرد "شطَن یشطُن شُطوناً (باب نصر سے) ہمیشہ لازم آتا ہے اور اس کے ایک معنی ہیں "بہت دور ہونا یا چلے جانا"۔ انتہائی گہرے کنویں کو "بئرٌ شَطُون" کہتے ہیں۔ اس طرح "شیطان" کے لغوی معنی میں "خیر سے دوری" یا "رحمت سے دوری" کی مناسبت پائی جاتی ہے۔

دوسرا قول: بعض کے نزدیک اس لفظ ـ شیطان ـ کا مادہ "ش ی ط"

اور وزن " فَعْلَانٌ " ہے۔ اس مادّے سے فعل ثلاثی مجرد شاطَ یشیط شَیْطاً " (باب ضرب سے) فعل لازم آتا ہے اور اس کے معنی " برباد ہونا " بھی ہیں اور " جل جانا " بھی۔ اور اسی مادے سے بابِ استفعال ("استشاط") "غصّے یا حسد سے جل بھن جانا" کے لئے آتا ہے۔ اس طرح " فَعْلَان " میں جو اسم الصفۃ کا وزن ہے۔ ان معنوں کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

تاہم ان دونوں " مادّوں " سے کوئی فعل ـــ مجرد یا مزید فیہ ـــ قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ لفظ " شیطان " کی ان دونوں " مادّوں " کے ساتھ معنوی مناسبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کے معنی معاجم یا قوامیس (ڈکشنریوں) میں عموماً ان دونوں ہی مادّوں کے تحت بیان کئے جاتے ہیں۔ تاہم اکثر اہل لغت " شطن " کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے لئے ان کے پاس کچھ مزید لغوی دلائل بھی ہیں[1]۔

[الرَّجِیْم] کا مادہ " رج م " اور وزن " فَعِیل " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد رَجَم یرجُم رجماً (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں " (کسی کو) پتھر مارنا "، یعنی یہ فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہ ـــ بغیر صلہ کے ـــ آتا ہے۔ اور یہیں سے یہ فعل " پتھر مار کر بھگا دینا " یا " پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا " کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ " رجیم " اور " مرجوم " ہم معنی ہیں یعنی " پتھر مار کر دور بھگایا ہوا "۔ جس کا ترجمہ " مردود " ، " لعین " اور " راندہ " کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے ـــ " فعیل " اکثر " مفعول " کے معنوں میں آتا ہے جیسے " کفّ خضیب " اور " لِحیۃ دَھین " ـــ " پتھر

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو۔ اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم لابن خالویہ ص ۷ ۔ ۸ ، تفسیر طبری (طبع البابی) ج ۱، ص ۴۹ ، تفسیر ابن کثیر (طبع دار المعارف) ج ۱، ص ۶۴ ، طبرسی (طبع بیروت) ج ۱، ص ۳۸۔

مارنا" کے بنیادی معنی سے ہی اس فعل (رجم) میں مار ڈالنا (قتل)، نشانہ بنانا (رمی)، دھتکار دینا (طرد)، گالی دینا (شتم) اور نیز تہمت لگانا یا اٹکل پچو بات کرنا (توہم) کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال پر بھی حسبِ موقع بات ہوگی۔

اس مادہ (رجم) سے قرآن کریم میں مختلف اسماء وافعال کے چودہ صیغے آئے ہیں۔ جن میں الرجیم (معرّف) دو دفعہ، رجیم (نکرہ) چار دفعہ اور دوسرے مشتقات آٹھ دفعہ آئے ہیں۔ ان پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی۔

اور چونکہ عربی زبان میں کبھی "فعیل" بمعنی "فاعل" بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے "رجیم" کے معنی "راجم" کے لئے ہیں یعنی گمراہ کرکے دوسروں کو رجم اور مردود بنا دینے والا۔ اگرچہ یہ معنی از قسم اِشارۂ بعید (FAR FETCHED) ضرور ہیں۔

الاعراب

[اَعُوْذُ] فعل مضارع معروف صیغہ واحد متکلم ہے۔ اس میں ضمیر مستتر "اَنَا" بطور فاعل موجود ہے۔ یہاں فعل مضارع بغیر کسی اعرابی تبدیلی کے، اپنی اصلی حالت میں ہے جسے نحوی اصطلاح میں فعل کی حالتِ رفع کہتے ہیں۔ اور علامتِ رفع اس میں "ذُ" کا ضمہ (ـُـ) ہے۔

[بِاللّٰہِ] میں با (بِ) حرف الجر ہے جس کی وجہ سے "اللّٰہ" مجرور ہے اور اس کی علامتِ جر آخری "ہ" کا مکسور ہونا ہے۔ جار مجرور (باللّٰہ) متعلق فعل (اَعُوْذُ) ہے اور چونکہ "بِ" فعل (اَعُوْذُ) کا صلہ بھی ہے، اس لئے "باللّٰہ" یہاں محلاً مفعول منصوب بھی ہے۔ اور اسی لئے بعض نحوی ایسی "بِ" کو بائے زائدہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ "با" نہ ہوتی تو پھر "اللّٰہ" فعل "اَعُوْذُ" کا مفعول ہوکر منصوب ہوتا۔

[مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ] = مِنْ + الشيطن + الرجيم

اس میں "مِنْ" حرف الجرّ اور "الشیطٰن" مجرور بالجر ہے جس کی علامتِ جرّ "نِ" کا مکسور ہونا ہے۔ "الرَّجیم" "الشیطٰن" کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ (صفت موصوف کی اعرابی مطابقت کی بناء پر)۔ اور اس (الرجیم) میں علامتِ جر "میم" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ یہ پورا مرکب جاری (مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) متعلق فعل ہے استعاذہ کا یہ پورا جملہ جملۂ فعلیہ ہے۔ جس کا اردو ترجمہ ہوگا ــــ میں پناہ مانگتا / مانگتی ہوں اللہ تعالیٰ کی شیطانِ مردود سے (بچنے کے لئے)۔

الرسم

"اعوذ باللہ من الشیطن الرّجیم" یعنی صیغۂ استعاذہ اگرچہ قرآنِ کریم کی کوئی آیت نہیں ہے تاہم اس کے تمام کلمات قرآنی کلمات ہیں۔ بلکہ اس کا نصفِ اوّل (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ) البقرہ: ۶۷ میں آیا ہے اور نصفِ ثانی (مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) قرآن کریم میں دو جگہ آیا ہے یعنی آلِ عمران: ۳۶ اور النحل: ۹۸ میں۔ اس لئے اس صیغہ کے کلمات کے رسم پر بات کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس صیغہ (استعاذہ) کے باقی تمام کلمات کی عام املاء اور رسمِ عثمانی میں کوئی فرق نہیں ماسوائے کلمہ "الشیطن" کے۔ یعنی "اعوذ"، "باللہ"، "من" اور "الرجیم" کا رسمِ معتاد اور رسمِ عثمانی ــــ یعنی طریقِ املاء ــــ ایک جیسا ہے ــــ البتّہ لفظ "شیطٰن" کا معاملہ مختلف ہے۔

یہ لفظ عام عربی املاء ــ رسمِ معتاد ــ میں "شیطان" لکھا جاتا ہے۔ تاہم یہ لفظ جو، بصیغۂ واحد قرآن کریم میں چونسٹھ جگہ معرف باللام اور چھ جگہ بصورتِ نکرہ آیا ہے، ان تمام مقامات پر یہ لفظ رسمِ عثمانی کے مطابق بحذفِ الف (یعنی "ط" اور "ن" کے درمیان الف کے بغیر) یعنی "شیطن" لکھا جاتا ہے۔ عام اردو فارسی یا

عربی میں اس کی املاء " شیطان " ہی ہے مگر قرآنِ کریم میں یوں لکھنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ علماءِ رسم کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے مصاحف میں یہ لفظ ہر جگہ اور ہر مصحف میں بحذفِ الف ہی لکھا گیا تھا۔ بعض ممالک ــــ خصوصاً ترکی۔ ایران اور چین کے مصاحف میں یہ لفظ باثباتِ الف (شیطان) لکھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اور رسمِ عثمانی کے نقطۂ نظر سے یہ غلطی ہے۔ البتّہ صرف صیغۂ استعاذہ میں اس طرح (باثبات الف) لکھنے کی گنجائش یوں نکلتی ہے کہ یہ صیغہ قرآنی آیت نہیں ہے تاہم چونکہ اس کے دونوں حصّے الگ الگ قرآن کریم کی آیات سے ہی ماخوذ ہیں۔ اس لئے مستحسن یہی ہے کہ اسے بھی قرآنی رسم کے مطابق ہی لکھا جائے۔

الضبط

صیغۂ استعاذہ کے ضبط کے سلسلے میں حسب ذیل امور قابلِ توجّہ ہیں:

" اعوذ " کے (ابتدائی) ہمزۂ قطع پر برصغیر، ترکی، ایران، چین میں علامتِ قطع " ء " نہیں ڈالی جاتی۔ صرف پاکستانی تجویدی قرآن مجید میں یہ علامتِ قطع ڈالی گئی ہے۔ تمام عرب ممالک خصوصاً سعودیہ، مصر اور شام میں یہ علامت ڈالی جاتی ہے بلکہ بیشتر افریقی ممالک مثلاً مراکش، لیبیا، تونس میں بھی یہی علامتِ قطع " ء " استعمال کی جاتی ہے یعنی اسے " أ " لکھتے ہیں۔ البتّہ نائیجریا اور غانا میں علامتِ قطع " ء " لکھی جاتی ہے یعنی " ءآ " لکھتے ہیں اور بعض دفعہ " ا " کے اوپر زرد رنگ کا گول نقطہ ڈالتے ہیں یعنی " •ا " لکھتے ہیں۔ " • " سے مراد زرد نقطہ ہے۔

" اعوذ " میں عین مضمومہ (پیش والی عین) کے بعد واو (" و ") پر علامتِ سکون ڈالنے کا رواج بھی صرف برصغیر پاک و ہند میں ہے۔ دنیا کے اور کسی اسلامی ملک میں واو ساکن ماقبل مضموم پر علامتِ سکون نہیں ڈالی جاتی۔ " ذ " پر علامتِ ضمہ ہر جگہ ڈالتے ہیں البتّہ مختلف ملکوں میں حرکاتِ ثلاثہ (ـَ ، ـِ ، ـُ)

کی صورت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے ۔

" باللّٰه " میں " بِ " کے بعد والے همزۃ الوصل پر علامتِ وصل بصورت " ٱ " لکھنے کا رواج صرف مصر، سعودیہ اور شام میں نظر آتا ہے باقی ایشیائی یا افریقی ملکوں میں اس کا رواج نہیں ہے ۔

اسم جلالت " اللّٰه " میں علامتِ تشدید پر علامتِ اشباع کے لئے الف مقصورہ (چھوٹا سا الف = کھڑی زبر) لکھنے کا رواج برصغیر پاک وہند کے علاوہ ترکی اور ایران میں بھی ہے۔ مگر کسی عرب اور افریقی ملک میں اس کا رواج نہیں ہے بلکہ وہ تشدید پر صرف فتحہ (ـَ) ڈال دیتے ہیں۔ یعنی اسے " اللَّه " لکھتے ہیں۔ حالانکہ تلفّظ کے لحاظ سے یہ " اَلّـه " نہیں بلکہ " اَللّا ہ " ہے ۔ اس لحاظ سے برصغیر اور ترکی و ایران کا ضبط عرب اور افریقی ممالک سے یقیناً بہتر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی یا مصری یا شامی مصحف میں ہماری طرف کا کوئی آدمی " اللَّه " کو صرف فتحہ سے بلا اشباع پڑھنے پر مجبور ہوگا جو صریحاً غلط ہے اور یہ عرب اور افریقی ممالک کے ضبط کا نقص ہے ۔ چین میں البتہ اشباع (حرف کو کھینچ کر پڑھنا) کی علامت کے طور پر اسم جلالت کی تشدید کے اوپر ایک لمبی اور ترچھی مد ڈالتے ہیں یعنی وہ " اللّٓه " لکھتے ہیں۔

مِنَ کے سلسلے میں صرف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صرف بعض افریقی ممالک (مثلاً تونس، مراکش، نائیجریا اور غانا) میں اس کے نون پر نقطہ نہیں ڈالتے ہیں۔ ان ممالک میں ضبط کا قاعدہ یہ ہے کہ کسی کلمہ (لفظ) کے آخر پر آنے والی " ی " ، " ن " ، " ف " یا " ق " پر نقطے نہیں ڈالتے ــــ البتہ یہی حروف کسی کلمہ کی ابتدا میں یا درمیان میں کہیں آئیں تو ان پر اپنے ملک کے رواج کے مطابق " نقطے " لگاتے ہیں ــــ یہ اپنے " رواج " والی بات ہم نے اس لئے لکھی ہے کہ ان ممالک میں " فا " کے نیچے ایک نقطہ اور " قاف " کے اوپر صرف ایک نقطہ ڈالا جاتا ہے یعنی " ف " کو " ب " اور " ق " کو " ف " لکھتے ہیں۔ البتہ تونس کے

بعض مصاحف میں ان حرفوں کو ہماری طرح لکھا بھی دیکھا گیا ہے۔

" الشیطن " کے شروع میں ھمزۃ الوصل پر علامتِ وصل برصغیر، ترکی، ایران اور چین میں نہیں ڈالی جاتی۔ مصر، سعودیہ اور شام میں یہ " ص " کے باریک سے سرے (" ص ") کی شکل میں لکھتے ہیں یعنی " ٱ "۔ افریقی ممالک میں اوپر ایک باریک سا نقطہ یا بڑا سبز رنگ کا نقطہ ڈالتے ہیں یعنی " اْ " یا " أ " کی صورت میں لکھتے ہیں۔ پھر اس ھمزۃ الوصل سے ماقبل کوئی حرف مفتوح ہو (جیسے یہاں " نَ " ہے) تو اس ھمزۃ الوصل (جو بصورت الف لکھا جاتا ہے) کے دائیں طرف اوپر والے سرے پر ایک باریک سی لکیر بڑھا دیتے ہیں یعنی " ـأ "۔ اور اگر ماقبل کوئی حرف مکسور ہو تو یہ لکیر الف کے نیچے ڈالتے ہیں یعنی " ـإ " اور اگر ماقبل کوئی حرف مضموم ہو تو یہ لکیر الف کے وسط میں ڈالتے ہیں یعنی " ـا " لکھتے ہیں۔ اس لفظ (شیطان) کے " ش " پر علامتِ تشدید مع فتحہ " ـّ " اور " یاء " پر علامتِ سکون ہر ملک میں یکساں ہی لکھی جاتی ہے ـــ البتہ " ط " پر برصغیر میں کھڑی زبر " ـٰ " لکھی جاتی ہے۔ جب کہ عرب اور افریقی ممالک میں " ط " پر فتحہ (ـَ) ڈال کر ساتھ (" ط " کے دوسری طرف) ایک کھڑی زبر (یا الف مقصورہ) ڈالتے ہیں یعنی " طَا " کی صورت میں لکھتے ہیں۔ اس لفظ (شیطان) کے آخری " ن " پر بعض افریقی ممالک میں نقطہ نہیں ڈالتے۔ جیسا کہ ابھی اوپر " مِنْ " کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔

" الرجیم " کے ابتدائی ھمزۃ الوصل ـ پر علامتِ وصل پاکستان، ترکی، ایران اور چین میں نہیں ڈالتے۔ عرب ممالک میں " ٱ " اور افریقی ممالک میں " اْ " یا " أ " کی صورت میں لکھتے ہیں جس میں " ہ " سے مراد ایک سبز گول نقطہ ہے ـــ اور چونکہ اس " ھمزۃ الوصل " سے ماقبل حرف مکسور (نِ) ہے۔ اس لئے اس الف کو یوں لکھتے ہیں " ـإ "۔ اس لفظ (الرجیم) کے " ج " اور " میم " کے درمیان والی " یاء " پر علامتِ سکون ڈالنے کا رواج بھی صرف برصغیر پاک و ہند میں ہی ہے۔ عرب اور افریقی ممالک بلکہ ایران، ترکی، چین وغیرہ میں بھی " یاء ماقبل مکسور " پر علامتِ سکون نہیں ڈالی جاتی۔

البتہ ایران اور ترکی میں یہاں " ج " کے نیچے صرف کسرہ (ـِ) کی بجائے کھڑی زیر (ـٖ) لکھنے کا رواج ہے۔

اس طرح صیغۂ استعاذہ کے مختلف اجزاء (کلمات) کی صورتِ ضبط یوں بنتی ہے۔

نوٹ کیجئے بنیادی رسم الخط ہر صورت میں یکساں ہے۔

أَعُوْذُ أَعُوْذُ اَعُوْذُ أَعُوْذُ أَعُوْذُ اَعُوْذُ

بِاللّٰهِ بِاللّٰهِ بِاللّٰهِ بِاللّٰهِ

مِنَ مِنَ

الشَّيْطٰنِ الشَّيْطٰنِ الشَّيْطٰنِ الشَّيْطٰنِ

الرَّجِيْمِ الرَّجِيْمِ الرَّجِيْمِ الرَّجِيْمِ

نوٹ: تلاوت سے پہلے یا بعد استعاذہ پڑھنے میں کیا حکمت ہے؟ کن امور میں بندے کو خدا کی پناہ طلب کرنے کا حکم (بصیغۂ امر) یا اس بات کی تعلیم بذریعہ قصہ دی گئی ہے اور کیوں؟ نیز " شیطان " کی حقیقت پر مباحث (اگرچہ ان میں سے بیشتر " ذہن فرسا " ہیں) وغیرہ کے لئے ایسی تفاسیر کی طرف رجوع کیجئے جو استناد اور اعتقاد کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں۔

سُورَةُ الفَاتِحَةِ

قرآن کریم کی پہلی سورت کے کئی نام یا "لقب" کتابوں میں مذکور ہیں مصاحف میں اس کا عنوان برصغیر اور بیشتر عرب اور افریقی ممالک میں اسی طرح لکھا جاتا ہے یعنی "سُوْرَةُ الفَاتِحَةِ"۔ البتہ بعض ممالک (مثلاً ترکی، ایران، نائیجیریا اور بعض دفعہ شام) کے مصاحف میں اس کا عنوان "سُوْرَةُ فَاتِحَةِ الکتابِ" لکھا جاتا ہے ۔ اور اس میں "الکتاب" سے مراد اللہ کی کتاب یعنی قرآن کریم ہی ہوتا ہے ۔

یہ سورۃ اکثر اہل علم کے نزدیک، بلحاظِ نزول، مکّی سورت ہے ۔ اور اس کی آیات کی کل تعداد بلا اختلاف سات ہے۔ تاہم اس بات میں اختلاف ہے کہ کہاں کہاں آیت ختم ہوتی ہے۔ مکّی اور کوفی "طریقۂ شمار" کے مطابق "بسم اللہِ الرّحمٰن الرحیم" اس سورۃ کی پہلی مکمل آیت ہے — باقی پانچ طریقہ ہائے شمار — یعنی مدنی اوّل وثانی، بصری، دمشقی اور حمصی — کے مطابق "بِسمِ اللہِ الرّحمٰن الرّحیم اَلحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِیْن" پر اس سورت کی آیت ۱ ختم ہوتی ہے یعنی "بسم اللہ" آیت کا جزء ہے۔ ان پانچ طرقِ شمارِ آیات کے مطابق "اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ" پر آیت ۶ ختم ہوتی ہے جب کہ پہلے دو — مکی اور کوفی — طریقۂ شمار کے مطابق وہاں — اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ پر — اختتام آیت نہیں ہے — اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں — برصغیر میں سورۃ کے اس پہلے "عَلَیْہِمْ" کے بعد غیر کوفی آیت کا نشان "ﮤ" ڈالا جاتا ہے۔ (پہلا اس لئے لکھا ہے کہ سورۃ میں "عَلَیْہِمْ" دو دفعہ آیا ہے۔)

لفظ " سُوْرَۃ " کی لغوی اصل کے بارے میں دو قول ہیں :۔

۱ ۔ پہلا قول : اس کا مادہ " س و ر " اور وزن " فُعْلَۃٌ " ہے ۔ فعل ثلاثی مجرد سَارَ یَسُوْرُ سَوْرًا (باب نصر سے) کے معنی ہیں۔ بلند ہونا ، دیوار پر چڑھنا اور اس مادہ سے ہی باب " تفعّل " کا ایک صیغہ فعل قرآن کریم (ص : ۲۱) میں وارد ہوا ہے ـــ اور اس سے ہی " سُوْرٌ " بمعنی شہر کی فصیل (بیرونی دیوار) آتا ہے اور یہ لفظ بھی قرآن کریم (الحدید : ۱۳) میں آیا ہے ـــ اس لفظ (سُوْرٌ) کے ایک معنی درجہ اور منزلت بھی ہیں۔ اور عربی زبان میں کامل اور مکمل اونٹنی کو بھی " سُوْرَۃٌ " کہتے ہیں ۔

۲ ۔ دوسرا قول : اس کا مادہ " س ء ر " اور وزن " فُعْلَۃ " ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد سَأَرَ یَسْأَرُ سُؤْرًا (باب فتح سے) اور سَئِرَ یَسْأَرُ سُؤْرًا (باب سمع سے) ہر دو کے معنی ہیں باقی بچنا ، کچھ حصّہ باقی رہ جانا ۔ اور "سُؤْرَۃٌ" کے معنی ہیں "بقایا حصّہ" یا (صرف) "حصّہ" ـــ اور ھمزۂ ساکنہ ماقبل متحرک کو اس کی حرکت کے موافق حرف (ا ، و ، ی) کی صورت میں پڑھنا جائز ہے یعنی عرب اس طرح بھی بولتے ہیں۔ اس بناء پر " سُؤْرَۃ " کو " سُوْرَۃٌ " بولنا بھی جائز ہے۔ ویسے یہ مادہ اور اس سے کوئی فعل قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

ـــ اس طرح لفظ " سُوْرَۃ " میں ـــ رتبہ ، درجہ ، منزلت ، ایک مکمل وحدت (UNIT) اور حصّہ کے معنی شامل ہیں۔

لفظ " الفاتحۃ " کا مادہ " ف ت ح " اور وزن " فَاعِلَۃٌ " ہے ۔ اور یہ فعل ثلاثی مجرد فَتَحَ یَفْتَحُ فَتْحًا بمعنی "کھولنا" سے اسم فاعل مؤنث کا معرف باللّام صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "کھولنے والی"۔ یہ اس سورۃ کا معروف اور زیادہ مستعمل نام ہے۔ قرآن کریم کو شروع سے کھولیں تو سب سے پہلے یہی سورت سامنے آتی ہے۔

اب ہم اللہ عزوجل کے بابرکت نام کے ساتھ اس سورۃ کا مطالعہ ـــ بلحاظ لغات و

اعراب اور رسم وضبط ـــــ شروع کرتے ہیں۔

۱:۱ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ بیان ہو چکا ہے کہ " بسم اللہ " (جسے قرّاء کی اصطلاح میں " بَسْمَلَة " کہتے ہیں) مکّی اور کوفی طریقۂ شمارِ آیات کے مطابق سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت ہے ـــ اس لئے اس کے اختتام پر آیت کا نمبر شمار ① دیا گیا ہے۔

۱:۱:۱ اللغة

[بِسْمِ] = بِ + اسْم ـــ " باء " (بِ) کے معنی اور مختلف استعمالات پر استعاذہ کی بحث میں بات ہو چکی ہے ـــ یہاں یہ (بِ) " کے ساتھ " ، " کی مدد سے " یا صرف " سے " کے معنی میں آیا ہے۔

لفظ " اِسْمٌ " (جو اردو کے لفظ " نام " کا ہم معنی ہے) کی لغوی اصل کے بارے میں دو قول ہیں :-

۱۔ اکثر اہلِ لغت کے نزدیک اس کا مادہ " س م و " (ناقص واوی) ہے اور اس کا وزن اصلی " فِعْلٌ " یا " فُعْلٌ " ہے۔ یعنی اس کی شکل اصلی " سِمْوٌ " یا " سُمْوٌ " ہے ـــ اہلِ عرب اس کے آخری واو (لام کلمہ) کو گرا کر باقی لفظ کو کئی طرح بولتے ہیں۔ مثلاً سِمٌ ، سُمٌ ، سُمًی ، اُسْمٌ اور اِسْمٌ ـــ ان میں سے زیادہ عام اور مستعمل صورت " اِسْم " ہی ہے ـــ اس طرح اب اس کا وزنِ استعمالی " اِفْعٌ " رہ گیا ہے۔ اس مادہ (سمو) سے فعل ثلاثی مجرد سَمَا یَسْمُوْ سُمُوًّا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں ـــ " بلند ہونا " ،

"رتبہ پانا" ـــــ اس طرح اس لفظ (اسم) کو اپنے معنوں سے یہ مناسبت ہے کہ اپنے اسم (نام) کی وجہ سے مُسَمّٰی (نام والا) دوسری چیزوں سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

۲۔ بعض ماہرینِ لغت کے نزدیک لفظ "اِسْم" کا مادہ "و س م" (مثال واوی) اور وزن اصلی "فِعْلٌ" یا "فُعْلٌ" ہی ہے۔ یعنی شکلِ اصلی "وِسْمٌ" (دونوں طرح) ہے۔ مگر یہاں اہلِ عرب ابتدائی "و" (فاءِ کلمہ) کو گرا کر اس کی جگہ ہمزہ (الف) لگا کر "اِسْمٌ" بولتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں اب اس کا وزن "اِعْلٌ" رہ گیا ہے۔ اس مادّے سے فعل ثلاثی مجرد وَسَم یَسِم وَسْمًا (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "..... پر ٹھپّہ لگانا" "..... کو نشان زدہ کرنا"، یعنی یہ فعل متعدی ہے۔ اور اس کے ساتھ مفعول بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتا ہے۔ یعنی "وَسَمَہٗ" کہیں گے۔ اس لحاظ سے لفظ "اسْم" کے معنوں کو اپنے مسمّٰی سے یہ مناسبت ہے کہ وہ اس کے لئے نشان یا علامتِ امتیاز ہے۔

گویا دونوں صورتوں میں مشترک شے "امتیاز" ہے۔ پہلے مادّہ میں "ممتاز ہونا" کا مفہوم ہے اور دوسرے میں "ممتاز کرنا" کا ـــــ اور لفظ "اسم" (نام) میں دونوں معنی شامل ہیں۔

تاہم اہلِ علم کی اکثریت پہلے قول ("سمو" والے) کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس کی ایک وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ "اسم" کی جمع "اَسماء" آتی ہے جس کا وزن "اَفْعَال" (اور شکلِ اصلی "اَسْماوٌ") ہے۔ اگر اس کا مادّہ "وسم" ہوتا تو اس کی جمع "اَوْسَام" آتی۔

دونوں صورتوں میں "اسم" کے شروع کا ہمزہ (بصورت الف) اصلی (یعنی مادّہ کا) نہیں ہے۔ بلکہ صرف ہمزۃ الوصل ہے جو حرفِ ساکن ("س") سے پہلے ضرورتاً (برائے تلفظ) لگایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی ماقبل (اپنے سے پہلے) حرف کے ساتھ وصل (ملنے) کی صورت میں یہ تلفظ سے ساقط (SILENT) ہو جاتا ہے۔

[اللّٰہ] ۔ عربی زبان میں یہ لفظ (جسے احتراماً " اسم جلالت " کہتے ہیں) پوری کائنات کے خالق و مالک کے نام کے طور پر قبل از اسلام دور میں بھی (بلکہ زمانہ ہائے دراز سے) استعمال ہوتا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث میں بھی یہی نام استعمال ہوا ہے ـــــ اس لئے اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ بلکہ جائز بھی نہیں ـــــ کسی اور زبان کا ـــــ ان ہی معنوں کے لئے مستعمل ـــــ کوئی لفظ بھی اس کا صحیح بدل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً فارسی کا " خدا "، ہندی کا " پرماتما " یا انگریزی کا " GOD " وغیرہ۔ مسلمانوں کو ہمیشہ اسم جلالت (" اللّٰہ ") ہی کے استعمال کو ترجیح دینی چاہیئے ۔ یہ اسلامی ثقافت کا نشان ہے ۔

فارسی یا پہلوی زبان کا لفظ " خدا " اب بہت سے مشرقی اسلامی ملکوں میں " اللّٰہ " کے ہم معنی بلکہ مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ عام زبان میں اس کا استعمال درست بھی سمجھا جائے تب بھی دینی تحریروں میں ـــــ اور خصوصاً قرآن و حدیث سے ترجمہ کرتے وقت اصل لفظ " اللّٰہ " کا استعمال ہی مناسب ہے ۔ بعض جاہلوں نے " خدا " سے بھی آگے بڑھ کر " اللّٰہ " کے لئے " قانونِ خداوندی " کا لفظ استعمال کر ڈالا ہے ۔ دراصل تو اس کے پیچھے ذاتِ الٰہی (PERSONAL GOD) کے انکار کا عقیدہ کارفرما ہے ۔ تاہم " خدا " کی بجائے " خداوند " کا لفظ استعمال کرنا تو صریح غلطی بلکہ جہالت ہے ۔ اس کے تو معنی ہی " خدا جیسا " کے ہیں ۔ اور اسی لئے مسیحی اسے حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔

لفظ " اللّٰہ " کی لغوی اصل کے بارے میں بیشتر اہلِ علم کی رائے تو یہی ہے کہ یہ دراصل " اَلاِلٰہ " (اَلْ + اِلٰہ) تھا ۔ یعنی " اِلٰہٌ " کو معرّف باللّام کر لیا گیا ۔ پھر کثرتِ استعمال کی بناء پر درمیانی ہمزہ ساقط کر دیا گیا اور دونوں " لام " مدغم ہو گئے اور یوں " تشدید " پیدا ہوئی ۔ اور یہ تشدید ـــــ بلکہ تفخیم (پُر کر کے پڑھنا) کے ساتھ تشدید ـــــ اسم جلالت کی خصوصیت ہے ۔ اور " اَلْ " کو بھی تعظیماً اس اسم کا مستقل حصہ بنا دیا گیا ہے جو کسی صورت میں اس سے الگ نہیں ہوتا ۔ اور اس کا معاملہ دوسرے معرف باللّام اسماء سے مختلف ہے ۔ مثلاً نداء میں اسے بالکل ہمزۂ قطع سمجھا جاتا ہے یعنی " یَا اَللّٰہ " کہیں

گے۔ اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عربی جاہلی اشعار میں "اَلْاِ لٰہ" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے [۱]۔

اس طرح لفظ "اللّٰہ" کے معنی سمجھنے کے لیئے لفظ "اِلٰہ" کے مادہ، اشتقاق لغوی اور بنیادی معنی کو جاننا ضروری ہے۔ لفظ "اِلٰہ" کے مادہ اور اس کی لغوی اصل کے بارے میں اہلِ لغت ونحو کی آراء واقوال کا خلاصہ یہ ہے:-

پہلا قول: اس کا مادہ "ا ل ہ" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ اس مادّے سے مستعمل کئی افعال اس اشتقاق کی دلیل بنتے ہیں مثلاً ——

(۱) اَلَہَ یَأْلَہَ (فتح سے) کے معنی عبَدَ یعبُدُ (نصر سے) یعنی عبادت کرنا ہیں۔ اس طرح "اِلَاہٌ" فِعَالٌ بمعنی مفعول ہے جیسے کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ گویا اِلَاہٌ = مَأْلُوْہٌ = مَعْبُوْدٌ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ "معبود" ہی کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ اس لفظ کا تلفظ یہی (اِلَاہٌ) ہے مگر اس کی املاء (رسم الخط) قرآن کریم میں بھی —— اور عام عربی میں بھی —— "اِلٰہ" ہی ہے۔
(۲) اَلِہَ اِلَی .... (سمع اور فتح سے) کے معنی ہیں ...... (کسی میں) سکون پانا یا غم اور مصیبت میں اس کی طرف رُخ کرنا۔ (فزِعَ اِلی .....) کسی کے لیئے بے تاب ہونا (وُلِعَ ب ....)۔
(۳) اَلِہَ (سمع سے) کے ایک معنی "حیرت میں ڈوب جانا (تحیّر) بھی ہوتے ہیں
(۴) اَلِہَہٗ (سمع اور فتح سے) کے معنی "...... کو بچانا" اور "...... کی حفاظت کرنا" بھی ہیں۔ یعنی فعل متعدی ہے اور مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔

دوسرا قول: اس (اِلٰہٌ) کا مادّہ "و ل ہ" اور وزن وہی "فِعَال" ہے۔ اور شکلِ اصلی "وِلَاہٌ" تھی جس میں "و" کو "ھمزہ" میں بدل دیا گیا۔ جس طرح "وَحَدٌ" سے "أَحَدٌ" بنا ہے۔

---

[۱] تفصیل کے لیئے دیکھیئے زمخشری (کشّاف) ج ا ص ۳۵، روح المعانی ج ا ص ۵۵۔

بعض افعال اس اشتقاق کی دلیل بنتے ہیں مثلاً ـــــ
لَہ وَلَہاً (ضرب اور سمع سے) کے ایک معنی جوش وخروش
ہوتے ہیں۔
سے) کے بھی ایک معنی "حیرت میں ڈوب جانا" ہیں (اَلِہ

بھی اَلِہَ اِلی ...... کے مندرجہ بالا تمام معنوں میں مستعمل ہے۔
ہ" اور " ول ہ") کو " اِلٰہ " کی اصل اس دلیل پر قرار دیا
ہے جس کیلئے بندوں کی طرف سے یہ " افعال " سرزد ہوتے
حال" میں سے ـــــ اَلِہَ بمعنی عبد (عبادت کرنا) اور
نا) کے سوا ـــ کسی اور فعل سے " اِلٰہٌ " مشتق بنتا
ہ کہ اشتقاق کا مطلب یہ ہے کہ "مشتق" میں اصل فعل کے
صورت فاعل یا مفعول یا صفت کے) ضروری ہے۔ مگران مذکورہ
چھوڑ کر) اکثر کے معنی مخلوق میں پائے جاتے ہیں نہ کہ خالق میں
لوگوں کی بات میں وزن معلوم ہوتا ہے جنہوں نے ان تمام
ح کی ذہنی عیاشی یا "علمی ہیضہ" قرار دیا ہے[1]۔
نہ اس (لفظ " اِلٰہ ") کا مادہ "ل و ہ" یا "ل ی ہ" ہے
یا لِیَاۃٌ بھی۔ اس سے فعل لاہ یلوہُ لَوھًا (ن) کے
(ن) "یعنی پیدا کرنا" بھی ہیں اور لاہ یَلِیْہُ لَیْھًا (ض)
(عَلَاوَ اِرْتَفَع) ہیں اور سورج کو اِلٰھَۃٌ (دیوی) کہنے
۔ نیز اسی مادہ (ل ی ہ) کے اسی باب (ضرب) سے

روح المعانی ج ۱ ص ۵۵ اور تفسیر طبرسی ج ۱ ص ۱۹ نیز اعراب القرآن

بمعنی "پوشیدہ ہونا" (تستّر واحتجب) بھی ہوتے ہیں ۔۔۔ لفظ "اِلٰہ" کے ساتھ ان معنوں کی نسبت بھی ۔۔۔ بلحاظ اشتقاق ۔۔۔ قدرے معقول معلوم ہوتی ہے ۔

لیکن بہت سے اہل علم ۔۔۔ بلکہ اہل دل ۔۔۔ کی رائے یہ ہے کہ چاہے لفظ "اِلٰہ" کا اشتقاق ان تمام مادّوں ۔۔۔ یا ان میں سے کسی ایک مادّہ ۔۔۔ سے درست بھی ثابت کر دیا جائے جب بھی اسم جلالت (اللّٰہ) سرے سے اسم مشتق ہے ہی نہیں ۔ یہ "اَلْاِلٰہ" سے بھی نہیں بنا[1] بلکہ دراصل اسی طرح ذات باری تعالیٰ کے لئے وضع کیا گیا ہے جس طرح دوسری بہت سی چیزوں کے نام ہیں ۔۔۔ مثلاً تمام اسماء جامدہ جو کسی ذات پر دلالت کرتے ہیں ۔۔۔ اور ہر ہر لفظ کا مشتق ہونا لازمی بھی نہیں ہوتا ۔ اور یہاں تو لفظ "اِلٰہ" کے لئے بناءِ اشتقاق بنائے گئے بیشتر معنوں کا ذات باری تعالےٰ پر اطلاق بھی محلِ نظر ہے ۔

[الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ] ان دو لفظوں کی لغوی اصل اور معنوں کے بارے میں مفسّرین اور ائمۂ لُغت ونحو کے اقوال کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

١ ۔ ان کا مادہ "ر ح م" ہے ۔ پہلے لفظ کا وزن "فَعْلَانٌ" (غیر منصرف) ہے اور دوسرے کا وزن "فَعِيْلٌ" ہے ۔ یعنی دونوں اسم مشتق ہیں ۔ اس مادّہ سے فعل ثلاثی مجرد رحِم یرحَم رحمةً (سمع سے) ہمیشہ متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے یعنی "رَحِمَہٗ"

---

[1] اس لئے کہ قرآن کریم میں تو کہیں "اَلْاِلٰہ" استعمال نہیں ہوا ۔ جاہلی اشعار میں اس کا استعمال ممکن ہے کسی خاص "معبودِ باطل" کے لئے ہی ہوا ہو جو شاعر کا معبودِ ذہنی ہو ۔ کیونکہ لفظ "الٰہ" کا اطلاق "معبودِ برحق" اور "معبودِ باطل" ہر دو پر ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کی جمع "آلِھَۃ" آتی ہے ۔ جبکہ اسم جلالت (اللّٰہ) عَلَم ہے ۔ اس کا اطلاق سوائے "ذاتِ برحق خالق مالک" کے کسی پر نہیں ہوتا نہ اس لفظ کی جمع آتی ہے ۔ گویا "الٰہ" کئی ہو سکتے ہیں مگر "اللّٰہ" ایک ہی ہے ۔

کہتے ہیں ـــــ " رَحِمَ عَلَیْہِ " کہنا بالکل غلط ہے ـــــ البتہ اردو میں اس کا ترجمہ " ..... پر رحم کرنا یا مہربانی کرنا " کیا جائے گا ۔ یہ " پر " اردو محاورے کی بنا پر آتا ہے ۔ مگر عربی میں مفعول بنفسہٖ یعنی صلہ کے بغیر آتا ہے ۔

۲ ۔ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں مگر " فَعلانُ " میں بمقابلۂ " فَعِیل " زیادہ مبالغہ ہوتا ہے ۔ اس لئے " رحمٰن " کے معنی " بے حد رحمت والا " اور " رحیم " کے معنی " بہت رحمت والا " ہوں گے ۔

۳ ۔ " رحمٰن " تو صیغۂ مبالغہ ہے مگر " رحیم " صفتِ مشبّہ ہے یعنی " رحمٰن " کثرتِ رحمت پر اور " رحیم " دوام رحمت پر دلالت کرتا ہے ۔ اس طرح " رحمٰن " کے معنی " بکثرت رحمت والا " اور " رحیم " کے معنی " ہمیشہ رحمت والا " ہوں گے ۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان اسماء کا اردو ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ـــــ

الرحمٰن : بڑا مہربان ۔ نہایت مہربان ۔ بے حد مہربان ۔ نہایت رحم کرنے والا ۔

الرحیم : مہربان ۔ بڑا رحم والا ۔ نہایت رحم والا ۔ بار بار رحم کرنے والا ۔

۴ ۔ " الرحمٰن " اسم صفت کے طور پر بھی صرف " اللہ " کے لئے استعمال ہوتا ہے ، جب کہ " رحیم " غیر اللہ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور (قرآن کریم میں) ہوا ہے ـــــ " الرحمن " ہمیشہ معرفہ (معرّف باللام) آتا ہے ـــــ (ماسوائے ندا کے یعنی جب منادٰی ہو) مگر " الرحیم " معرفہ نکرہ دونوں طرح آتا ہے ۔

۵ ۔ قرآن کریم میں متعدد بار " الرحمن " بھی " اللہ " کی طرح ایک مستقل اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے[1] ۔ بلکہ بعض جگہ تو گویا " اللہ " کے بدل اور مترادف کے طور پر آیا ہے[2] ۔ جب کہ " الرحیم " ہر جگہ بطور " صفت " کے ہی آیا ہے ۔

---

[1] لفظ " الرحمن " قرآن کریم میں (۵۷) جگہ آیا ہے جس میں سے کم از کم (۴۵) مقامات ایسے ہیں جہاں وہ " اللہ " کی جگہ بطور اسم استعمال ہوا ہے ۔ سورۂ مریم ، طٰہٰ ، الانبیاء ، یٰسٓ ، الزخرف اور الملک میں اس قسم کے استعمال کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں ۔

[2] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۶ ۔ " الرحیم " قرآن کریم میں ہر جگہ " رحمت " سے متعلق ہو کر آیا ہے ـــــ [اور یہ لفظ (رحیم) قرآن کریم میں بصیغہ نکرہ یا معرفہ مجموعی طور پر (۹۰) جگہ آیا ہے] ـــــــ جبکہ " الرحمن " عذاب، حکومت، ہیبت اور اقتدار کے ذکر کے ساتھ مربوط ہو کر بھی وارد ہوا ہے[1] ۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لفظ " رحیم " کی جمع رحماء مستعمل ہے جبکہ لفظ رحمٰن کی جمع نہیں آتی ۔

۷ ۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک " رحمن " دراصل غیر عربی (عبرانی) لفظ ہے جو اپنی اصل زبان میں " اللہ " ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ پھر عربی میں بھی " اللہ " کے ہم معنی ـــ یا " اللہ " ہی کا دوسرا نام سمجھا جانے اور استعمال کیا جانے لگا ـــ اور اس مقصد کے لئے یہ ہمیشہ معرف باللام آتا ہے ۔ اکثر اہلِ علم نے اس کی اصل عبرانی یا سُریانی بتائی ہے اور یہ کہ یہ اصل میں " رخمان " یا " رھمان " تھا[2] ۔ قرآن کریم میں حضرت ہارون علیہ السلام کے قول (طٰہٰ : ۹۰) سے بھی کم از کم بالواسطہ طور پر اس نظریہ کی تائید کا کچھ پہلو نکلتا ہے ۔

۸ ۔ مندرجہ بالا ۵ ، ۶ ، ۷ کی روشنی میں " رحمن " کا مادہ " رح م " سے مشتق ہونا بھی محلِ نظر ٹھیرتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے عجمی الفاظ عربی اوزان پر پورے اترتے نظر آتے ہیں تاہم یہ ان کے عربی الاصل ہونے کی پکّی دلیل نہیں ہوتی ۔

۹ ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ " رحمن " اپنے اصل معنوں میں بھی " رحمت والا " ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہو ۔ پھر عربی میں بھی ان ہی معنی کے ساتھ آیا ہو ۔ عربی کی طرح عبرانی، سریانی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) مثلاً البقرہ : ۱۱۶ ، مریم : ۸۷ و ۸۸ اور البقرہ : ۸۰ اور الاسراء : ۱۱۰ تو ان معنوں کے لئے بالکل واضح ہے ۔

[1] مثلاً مریم : ۴۵ ، الفرقان : ۲۶ اور النبأ : ۳۸ میں

[2] ابن کثیر (طبع دارالمعارف) ج ۱ ص ۳۷ ، مزید حوالوں کے لئے دیکھئے قاموس قرآن (قرشی) ج ۲ ص ۵۷ ۔ نیز دیکھئے " مدّ القاموس " تحت مادہ " رحم " جہاں اس کی اصل بحروف عبرانی لکھی ہے ـــ غرائب اللغۃ العربیہ (ص ۱۸۲) میں اس کی اصل آرامی بتائی گئی ہے ۔ اور اس کی اصل شکل " رحمونو " بحروف سریانی لکھی گئی ہے ۔

آرامی وغیرہ بھی سامی زبانیں ہیں اور ان سب میں الفاظ کی بنیاد عموماً ایک تین حرفی مادہ ہوتا ہے (جو یہاں "رحم" ہے) اور ان زبانوں کے بعض مادوں میں لفظی اور معنوی مماثلت اور مشارکت عام پائی جاتی ہے۔ اسی طرح آریائی زبانوں کے بہت سے ہم معنی کلمات کا تلفظ بھی مماثل یعنی ملتا جلتا پایا جاتا ہے مثلاً سنسکرت بھراتر، فارسی برادر اور انگریزی کے BROTHER وغیرہ میں۔

۱۰۔ بہرحال اگرچہ لفظ عجمی بھی تھا تب بھی نزول اسلام کے وقت یہ عربی زبان میں اپنے مذکورہ معنی کے ساتھ مستعمل تھا۔ قرآن کریم (الفرقان: ۶۰) اور واقعات سیرت (مثلاً صلحنامہ حدیبیہ کی تحریر کے وقت) میں جہاں کفار مکہ کے "الرحمن" سے شناسائی کے انکار کرنے کا ذکر آتا ہے وہ صرف اظہار تکبر اور "ناک چڑھانے" والی بات تھی ورنہ "الرحمن" کا استعمال جاہلی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ لوگ ذات باری تعالےٰ کے لئے "اللہ" کا لفظ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۷، تفسیر کشاف ج ۱ ص ۴۲ (مع حاشیہ) قاموس قرآن ج ۲ ص ۷۶، وغیرہ کو دیکھئے۔

۱:۱:۲ الاعراب

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"

کے شروع کی "باء" [بِ] حرف الجر ہے اور ["اسم"] مجرور بالجر ہے جس میں علامت جر "م" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ اور یہ آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف ہے (نہ اس پر لام تعریف آیا ہے نہ آخر پر تنوین)۔

["اللّٰهِ"] مجرور بالاضافۃ ہے (اسم کا مضاف الیہ ہوکر) اور اس میں علامت جر آخری "ھاء" کی زیر (کسرہ) ہے۔

["الرحمٰن"] بلحاظ اعراب "اللہ" کے تابع ہے[1] اور پھر اس کی بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

... صفت غالب ہونے کی وجہ سے ... کا بدل بھی ہو سکتا ہے۔
... لفظ "بدل" نحوی اصطلاح ہے۔

... اللہ کی نعت (صفت) بھی ہو سکتا ہے — دونوں صورتوں میں وہ لفظ "اللّٰہِ" کی وجہ سے مجرور ہے اور علامت جر "نِ" کا کسرہ (ـِــ) ہے۔ لفظ "الرحمٰن" ویسے تو غیر منصرف ہے مگر معرف باللام ہونے کی وجہ سے بحالت جر اس کے آخر پر کسرہ (ـِــ) آئی ہے۔

[الرحیم] یقیناً صفت ہے۔ تاہم اگر "الرحمٰن" کو بدل مانا جائے تو پھر یہ "الرحمٰن" کی صفت ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بدل کے بعد مُبدَل منہ (جو یہاں "اللّٰہ" ہے) کی صفت نہیں آیا کرتی۔ اور اگر "الرحمٰن" کو (اللہ کی) صفت مانا جائے تو پھر "الرحیم" بھی اس (اللہ) کی دوسری صفت ہو سکتا ہے۔ اور اس کے مجرور ہونے کی یہ دونوں وجہیں ہو سکتی ہیں۔ علامت جر اس میں آخری میم (م) کا کسرہ (ـِــ) ہے۔

لفظوں کے الگ الگ معنی اور مندرجہ بالا ترکیب (نحوی) کے مطابق پورے "بسم اللّٰہ" کا لفظی ترجمہ کچھ یوں ہو گا۔

۱۔ الرحمٰن کو بدل مانیں تو ترجمہ "اللہ یعنی بڑے مہربان "رحمٰن" کے نام کے ساتھ" ہو گا۔

۲۔ اور اگر "الرحمٰن الرحیم" دونوں کو صفت (نعت) مانیں تو اردو ترجمہ "رحیم و رحمٰن یعنی دائم الرحمۃ اور کثیر الرحمۃ اللہ کے نام کے ساتھ" ہو گا۔

——— اس لئے کہ اردو میں عموماً صفت اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے۔ تاہم اردو کے محاورے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "اللہ کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان بار بار رحم کرنے والا ہے" سے کیا جاتا ہے — یہاں "جو" کسی اسم موصول کا ترجمہ نہیں بلکہ اردو میں صفت موصوف کی ترکیب کا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لفظ تابع یہاں نحوی اصطلاح کے طور پر آیا ہے۔ توابع اربعہ (نعت، عطف، توکید و بدل) اور ان کے احکام نحو کا معروف موضوع ہے۔

ایک انداز ہے۔

اردو ترجمہ اور عربی تراکیب (نحوی) سے ظاہر ہے کہ پورا "بسم اللہ" ایک مکمل جملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو (سارا بھی) ایک مرکب جاری (یعنی جار و مجرور) ہی رہ جاتا ہے۔ مکمل جملہ (مرکب تام یا مفید) بنانے کے لئے اس کے شروع میں کسی مبتداء یا فعل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

۱۔ یا تو اس کے شروع میں لفظ "ابتدائی" مقدّر (UNDERSTOOD) مانیں تو یہ جملہ اسمیہ بن کر ذہن میں آئے گا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں سمجھا جائے گا "میری ابتداء یا آغاز یا میرا شروع اللہ کے نام سے ہے جو .... الخ"

۲۔ یا پھر کوئی فعل مثلاً "اَبْتَدِئُ" یا اِبْتَدَأْتُ" مقدّر (UNDERSTOOD) سمجھیں تو جملہ فعلیہ بن کر ذہن میں آئے گا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں بنے گا — "میں ابتداء کرتا ہوں یا شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو .... الخ" —— اور "بسم اللہ" کے اردو تراجم میں کسی نہ کسی طرح لفظ "شروع" لانے کی وجہ یہی ہے۔

"بسم اللہ" کے شروع میں کوئی فعل نہ لانے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر جو کام بھی کریں (اور مسلمان کو ہر کام بسم اللہ کے ساتھ شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے) تو "بسم اللہ" کی "با" (کے ساتھ) کی وجہ سے اس فعل (یعنی کام) کے مطابق معنی خود بخود سمجھے جائیں گے۔ مثلاً آکُلُ (میں کھاتا ہوں)، اَشْرَبُ (میں پیتا ہوں)، اَکْتُبُ (میں لکھتا ہوں)، اَرْکَبُ (میں سوار ہوتا ہوں)، اَقْرَأُ (میں پڑھتا ہوں) یا اَذْبَحُ (میں ذبح کرتا ہوں) (وغیرہ) اللہ کے نام کے ساتھ جو .... الی آخرہ۔

۱:۱:۳ الرسم

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا یہ طریق املاء رسم عثمانی کے مطابق ہے۔ اور عربی زبان کے عام رسم املائی میں بھی اسے لکھنے کا یہی قرآنی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

اس کے " رسم " کی حسب ذیل خصوصیات قابلِ توجہ ہیں :-

۱۔ اس میں " اسم " کا ابتدائی ھمزۃ الوصل (جو الف کی شکل میں ہوتا ہے) حذف کر کے " باء (بِ) " کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے یعنی " بِسْمِ " جس میں " اسم " کا " الف " (جو ھمزۃ الوصل ہے) خطاً اور لفظاً دونوں طرح محذوف ہے۔ نہ لکھا جاتا ہے نہ پڑھا جاتا ہے۔ " اسم " کا یہ " الف " اگرچہ ھمزۃ الوصل ہی ہے اور اگر لکھا بھی جاتا تب بھی یہاں (بوجہ وصل) پڑھا نہ جاتا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں " بِاسْمِ رَبِّكَ " وغیرہ میں آیا ہے۔ تاہم اسے کتابت میں حذف صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ (یعنی لفظ اسم) اسمِ جلالت (اللہ) کی طرف مضاف ہو اور اس (اسم) سے پہلے " باء " (بِ) آرہی ہو — یعنی صرف " بسمِ اللہ " کی صورت میں۔ قرآن کریم میں ہر سورت کی ابتدائی " بسم اللہ " کے علاوہ دو اور مقامات پر یہ اس ترکیب اور اس کتابت کے ساتھ آیا ہے [ھود : ۴۱ ، اور النحل : ۳۰] — اگر یہ لفظ (اسم) اللہ تعالیٰ کے کسی اور (صفاتی) نام کی طرف مضاف ہو تو " باسم " ہی لکھا جاتا ہے (اگرچہ الف بوجہ ھمزۃ الوصل ہونے کے پڑھا نہیں جاتا)۔ اس کی تین مثالیں تو قرآن کریم میں ہی آئی ہیں [الواقعۃ : ۷۴ ، ۹۶ اور الحاقۃ : ۵۲][1]

اگر (بِ) کے علاوہ کوئی اور حرفِ جار آجائے تو " اسم " کا ھمزۃ الوصل کتابت میں حذف نہیں ہوگا۔ مثلاً کوئی کہے " لِاسْمِ اللّٰهِ حَلَاوَةٌ " (اللہ تعالیٰ کے نام میں ایک مٹھاس ہے) یا کوئی کہے " لَيْسَ اسْمٌ كَاسْمِ اللّٰهِ " (کوئی نام اللہ تعالیٰ کے نام کی مانند نہیں ہے) — بلکہ بعض اہل علم تو اس " رسم " کو اس حد تک " بسم اللہ " کی

---

[1] قرآن کریم میں لفظ " اسم " کل ۲۷ دفعہ آیا ہے۔ نو دفعہ تو " اسم اللہ "، آٹھ بار " اسم ربک "، ایک دفعہ " اسم ربہ " کی صورت میں، پانچ مقامات پر " اسمہ " اور تین جگہ " بسم اللہ " اور ایک جگہ " بئس الاسم الفسوق " کی شکل میں۔ مزید وضاحت کے لئے دیکھئے المعجم المفہرس (فؤاد عبدالباقی) تحت مادہ " سمو "۔

خصوصیت بتاتے ہیں کہ اگر " بسم اللہ " کے بعد " الرحمن الرحیم " کی بجائے کوئی اور صفاتی نام لکھے جائیں تو بھی اسم کا ھمزہ حذف نہ ہوگا مثلاً " باسْمِ اللّٰہِ الملکِ القدوسِ " لکھنے میں ۔ خیال رہے (ب) کے علاوہ کسی دوسرے حرف الجرّ کے ساتھ لفظ اسم کے مرکب ہو کر آنے کی قرآن کریم میں کوئی مثال نہیں ہے ۔

رہی یہ بات کہ آخر اس املائی فرق کی وجہ کیا ہے ؟ یا یہ کہ " بسْم " میں " ب " کا نبرہ (دندانہ) اونچا کیوں لکھا جاتا ہے مثلاً " بِسْم " کیوں نہیں لکھا جاتا ؟ وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات کتب رسم میں اٹھا کر ان کے جواب بھی لکھے گئے ہیں ۔ ایسے بزرگوں پر اللہ کی رحمت ہو مگر ان کے ان " منطقیانہ " اور " فلسفیانہ " ارشادات سے اس فلسفی کی کہانی یاد آتی ہے ۔ جس نے دیوار پر اُپلے لگے دیکھے تو فلسفیانہ توجیہات میں کھو گیا ۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانی میں یہ الفاظ و مرکبات اسی طرح لکھے گئے تھے ۔ ہم رسمِ عثمانی کی تقلید اور اس کے اتباع کے پابند ہیں ۔ اس پر تنقید یا اس کی توجیہہ نہ جائز ہے نہ لازم ۔ اور نہ ہی ہر عقلی توجیہہ ہمیشہ درست ہوتی ہے[1]۔

۲۔ اسمِ جلالت کی املاء " اللہ " ہے ۔ حالانکہ اس کا تلفظ " اللّاہ " یا " اَلْلَاہ " ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں ہمیشہ ۔ اور اس کے اتباع میں عام عربی املاء میں اسے ہمیشہ اسی طرح (اللہ) لکھا جاتا ہے ۔ یعنی " ا ل ل ھ " کے ساتھ ۔ خط یا اندازِ کتابت مختلف ہو سکتا ہے مگر بنیادی رسم اور املاء یہی رہے گا ۔ مثلاً لاہوری اردو نستعلیق میں اسے " اللہ " لکھتے ہیں ۔ اور یہ بالکل درست ہے اس میں اصل املاء محفوظ ہے ۔ اس اردو کتابت کے موجد حافظ محمد یوسف سدیدیؒ تھے ۔ فارسی،

---

[1] مزید بحث کے لئے چاہیں تو دیکھئے نثر المرجان ج ۱ ص ۹۲ - ۹۴ ۔ البیان (للانباری) ج ۱ ص ۱ اور القیسی کی " مشکل الاعراب " ج ۱ ص ۱۵ ۔ خصوصاً مقدم الذکر جس میں " بسم اللہ " کی کتابت کے بارے میں بعض ماثور روایات بھی مذکور ہیں ۔ جن میں سے بعض کی صحت بھی محلِ نظر ہے ۔

تراِلی (جب یہ بحروف عربی لکھی جاتی تھی) اور پرانی اردو نستعلیق میں اسے " اللہ " کی صورت میں بھی لکھا جاتا (رہا) ہے جو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ اس میں دوسری " ل " کو بالکل نبرہ (دندانہ) کی شکل دے دی گئی ہے (یعنی بَ یا نَ یا یَ کی مانند) اور آخری " ھ " نستعلیق کے لحاظ سے تو " د " کا آخری پیوند معلوم ہوتا ہے ۔ تاہم املاء کے بنیادی چار حروف (ا ل ل ہ) اس میں موجود ضرور ہیں چاہے ان کے لکھنے کا انداز علمی لحاظ سے معیوب سمجھا جائے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض افریقی ممالک (مثلاً غانا) کے مصاحف میں یہ لفظ " اللہ " لکھا جاتا ہے اس میں آخری ترچھا حصّہ تو " ہ " ہی ہے جسے " ۸ " کی طرح لکھ دیا گیا ہے ۔ البتّہ درمیانی " لام " کو بَ ۔ نَ اور یَ وغیرہ کے نبرہ (دندانہ) کی طرح لکھا گیا ہے یعنی اردو کے قدیم نستعلیق خط کی مانند ۔ چین میں یہ لفظ " اللہ " کی شکل میں لکھا جاتا ہے یعنی دونوں لام (کے سرے) آخری " ہ " سے ذرا نیچے رہ جاتے ہیں تاہم اصل املاء (ا ل ل ہ) محفوظ ہے ۔

۳ ۔ [الرحمن] اس جگہ (بسم اللہ میں) بلکہ پورے قرآن کریم میں ہر جگہ (" م " کے بعد والے) الف کے حذف کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ (اور یہ لفظ قرآن کریم میں ۔ بسم اللہ کے علاوہ ـــ ستاون (۵۷) دفعہ آیا ہے) ۔ اور رسم عثمانی میں اس کا اسی طرح (بحذف الف) لکھا جانا بلا اختلاف ثابت ہے ـــ یعنی اسے " الرحمان " لکھنا سخت غلطی ہے ۔ اور اسی قرآنی رسم الخط کے اتباع میں ـــ یہ لفظ عام عربی املاء میں بھی عموماً اسی طرح (بحذف الف) لکھا جاتا ہے ۔ بلکہ جہاں بھی یہ اسم " اللہ " کے بدل یا اس کی صفت کے طور پر مستعمل ہو وہاں بھی اسے اسی رسم کے ساتھ لکھنے کا رواج ہے ۔ مثلاً " عبدالرحمن " میں ۔

۴ ۔ اور [الرحیم] کی یہ املاء تو خیر عربی کے عام املائی قواعد کے بھی مطابق ہی ہے ۔

۴:۱:۱ الضبط

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں چار کلمات کی ابتداء میں ھمزۃ الوصل آتا ہے۔ [اسم ، اللہ ، الرحمن اور الرحیم] "اسم" کے ھمزہ کے کتابت میں محذوف ہونے کی بات ابھی بحث الرسم میں ہوچکی ہے۔ باقی تین کلمات کا ھمزۃ الوصل کتابت میں موجود رہتا ہے اگرچہ بوجہ وصل پڑھا نہیں جاتا۔ ھمزۃ کی اس "خاموشی" کو عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں ھمزہ (بصورت الف) پر وصل (صلہ) کی علامت ڈال کر ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ علامت عرب ممالک میں تو "ص" کا باریک سرا (صـ) ہوتا ہے (ٱ) ۔ افریقی ممالک میں یہ اکثر سیاہ گول نقطہ کی شکل میں لکھتے ہیں۔ البتہ بعض ممالک میں یہ نقطہ باریک اور بعض میں زیادہ نمایاں لکھا جاتا ہے (أ ، أ)۔ بعض افریقی ممالک میں ھمزۃ الوصل کے لئے الف کے اوپر بڑا سا سبز رنگ کا گول نقطہ ڈالا جاتا ہے ـــ اس کے مقابلے پر ھمزۃ القطع کے لئے زرد رنگ کا بڑا سا گول نقطہ ڈالتے ہیں ـــ تاہم یہ اہتمام صرف رنگ دار طباعت میں کیا جاتا ہے ـــ یا قلمی مصاحف کے دور میں مختلف رنگ کی سیاہی استعمال کی جاتی تھی ـــ یعنی تمام حروف کالی سیاہی سے، تمام حرکات سرخ روشنائی سے، ھمزۃ الوصل سبز گول نقطے سے اور ھمزۃ القطع زرد گول نقطے سے ظاہر کئے جاتے تھے ـــ آج کل طباعت میں سب کچھ کالی سیاہی میں چھپنے کے باعث ھمزۃ الوصل کے لئے الف پر گول نقطہ اور ھمزۃ القطع کے لئے "ء" یا "E" کی علامت استعمال ہوتی ہے (أ ، ا ، آ ، أ) ۔ برصغیر، ایران، ترکی اور بیشتر مشرقی ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جو بھی حرف "خاموش" ہے یعنی پڑھنے میں نہیں آتا اس کو ہر طرح کی علامتِ ضبط سے عاری یعنی خالی رکھا جاتا ہے۔ اور یہ قاعدہ صرف ھمزۃ الوصل میں ہی نہیں بلکہ حرفِ شمسی سے ماقبل لام اور واو جمع کے بعد آنے والے الف پر اور وصلِ حروف کی بعض دوسری صورتوں میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جس کی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

اسم جلالت "اللہ" میں درمیانی لام اِشباع سے (کھینچ کر) پڑھا جاتا ہے یعنی "اللاہ" کی طرح۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ تمام عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف

ہیں اسے " اللّٰہ " لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس ضبط کے ساتھ تو اسے " اَلّٰہ " ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ اسے کس طرح ٹھیک تلفظ سے پڑھتے ہیں۔ غالباً اپنی عربی دانی کی بنا پر یا اس لئے کہ " اللہ " کا یہ (با اشباع) تلفظ ان کے ہاں جانا پہچانا ہے۔ تاہم ناخواندہ یعنی صرف ناظرہ خوان غیر عربی دان تو اس ضبط کے ساتھ اسے کبھی درست نہیں پڑھ سکتا۔

ایران، ترکی اور برصغیر میں اس کا ضبط یہ اختیار کیا گیا ہے " للّٰہ " یعنی علامت تشدید (ـّ) کے اوپر کھڑی زبر (ـٰ) لکھی جاتی ہے۔ جو لام کے اشباع (مدِ طبیعی) کی علامت ہے ۔۔۔ چین میں [اور شاید وسط ایشیا کی ان مسلمان ریاستوں میں بھی جو اب روس کے قبضے میں ہیں، یہی طریقہ رائج رہا ہو] اس کو اِں ضبط کیا جاتا ہے " اللہٓ " یعنی پورے لفظ پر ایک لمبی ترچھی مگر باریک " مد " ڈال دی جاتی ہے اور یہ بھی لام کے اشباع پر دلالت کرتی ہے ۔۔۔ مگر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں قاری کو اس اشباع سے آگاہ کرنے والی کوئی علامت ضبط نہیں لگائی جاتی۔

کتب علم الضبط میں عرب اور افریقی ممالک کے اس طریق ضبط کی ایک تعسفیانہ ور منطقی توجیہ یہ مذکور ہوئی ہے کہ یہ اسے (اسم جلالت کو) لفظ " اللات " سے ممتاز کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جو ایک بت کا نام تھا۔ (دیکھئے قرآن کریم النجم : ۱۹ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ جس کا ضبط ان کے ہاں یوں ہے " اَللّٰت " یعنی دوسرے لام پر (پہلا تو خاموش ہی ہے) ۔۔ تشدید مع فتحہ " ـَّ " ڈال کر اس " ل " اور " ت " کے درمیان چھوٹا سا الف (کھڑی زبر ـٰ) ڈالتے ہیں جس سے " لا " کی آواز پیدا ہوگی ۔۔ حالانکہ ضبط کے اس فرق سے الٹا " اللات " کے لام کے اِشباع کا تو بندوبست کر دیا گیا ہے مگر " اللہ " کی لام کا اشباع اشتباہ میں ڈال دیا گیا ہے ۔۔۔ اس مسئلے کا درست حل تو علم التجوید میں ہے کہ اسم جلالت (اللّٰہ) ماقبل مفتوح یا مضموم ہو تو تفخیم سے (پُر کر کے) پڑھا جائے گا مگر " اللات " ماقبل مضموم ہوتے ہوئے بھی مفخّم نہیں پڑھا جائے گا۔

تاہم ضبط کے نقطۂ نظر سے اسم جلالت میں لام کے اِشباع کے لئے کوئی علامت ضبط نہ ڈالنا عرب اور افریقی ممالک کے ضبط کا ایک عیب ہے۔ جبکہ مشرقی (عجمی) ممالک کے

مسلمانوں نے محسوس کیا اور اس کے لئے ایک علامت (ﷲ) مقرر کی۔ بلکہ اب تو ایک پاکستانی عالم (مولوی ظفر اقبال مرحوم) نے " اللہ " کی تفخیم کے لئے بھی ایک خاص علامت (ﷲ) وضع کی ہے ۔ جسے تجویدی قرآن مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ، لاہور میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

در اصل عرب اور افریقی ممالک میں الف مدّہ محذوفہ میں ماقبل کی فتحہ (ـَـ) لکھے بغیر مدّ کا تصور ہی نہیں ہے ۔ اس لئے وہ اسم جلالت کے لام پر شدّ اور فتحہ (ـّـَ) ڈالتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ مدّ کی خاطر الف محذوفہ کا اثبات (بصورت چھوٹا الف یا کھڑی زبر) بھی کیا جائے تو پھر اسے " اللّٰہ " لکھنا پڑے گا جو ان کے ضبط کے مطابق لکھے ہوئے " اللّٰت" سے مشابہ ہی ہو جائے گا۔ اس لئے ان تمام ملکوں میں یہ لفظ یعنی اسم جلالت غلط علامت ضبط کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کا درست پڑھنا صرف شفوی (زبانی) تعلیم پر منحصر ہے ـــ

برصغیر وغیرہ میں صرف کھڑی زبر (ـٰ) کو الف ماقبل مفتوح (ـَـ ا) کے برابر سمجھا جاتا ہے اور یوں اسم جلالت پر ڈالی گئی علامت (ﷲ) کو (ـّـَ ا) کے برابر سمجھ کر پڑھا جاتا ہے ۔ اور یہ بات عرب اور افریقی ملکوں کے اہلِ علم تک سمجھ نہیں پائے ۔

اسم جلالت کے اس ذرا مفصّل تقابلِ ضبط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرب اور افریقی ممالک کا ضبط غیر عربی دان ناظرہ خوانوں کے لئے موجب التباس ہے اور " اللہ " جیسے اہم کلمہ کے [جسے نہ صرف لام کے اشباع بلکہ اس کی تفخیم کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے ـ جب کہ اس کا ماقبل مضموم یا مفتوح ہو] غلط پڑھنے کا باعث بن سکتا ہے ۔ اور اس سے سعودی حکومت کے اس حکم کی نامعقولیت واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے ان تمام حجّاج کو حرمین شریفین میں رکھے ہوئے حکومت کے اپنے مطبوعہ مصحف سے تلاوت پر مجبور کیا جاتا ہے ۔ جو اس مصحف کے طریقِ ضبط سے قطعاً نا آشنا ہونے کے باعث قرآن کریم کی صحیح تلاوت سے بھی محروم رہتے ہیں ۔

[الرحمن] کی " میم " کے اشباع کے لئے بھی (اور تمام محذوف الالف الفاظ ـــ اسماء ہوں یا افعال یا حروف کے لئے بھی) ـــ مختلف علاماتِ ضبط کا رواج ہے ۔ عرب اور افریقی ممالک میں اس کے لئے میم پر فتحہ (ـَـ) ڈال کر ساتھ چھوٹا

سا الف (جو محذوف تھا) لکھتے ہیں ("سمٰ") اس لئے کہ اس کا اصل تلفظ "الرحمان" تھا مگر رسم عثمانی میں اس کا الف محذوف تھا۔ اس لئے میم پر فتحہ (مَ) کے بعد اس محذوف الف کی یادگار چھوٹا سا الف یا کھڑی لکیر ڈالی جاتی ہے تاکہ اسے "ما" پڑھا جاسکے۔ بعض ممالک ــ مثلاً لیبیا ــ میں یہ محذوف الف خاصا "موٹا" اور نمایاں لکھا جاتا ہے (سمٰا) اور بعض عرب اور افریقی ملکوں (مثلاً تونس) میں اسے عام کتابت سے باریک مگر زیادہ لمبا کرکے لکھا جاتا ہے ("سمٰا")۔ تاہم عام طور پر اسے عام کتابت کے الف (ا) سے قریباً نصف یا تہائی کے برابر ہی لکھتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند اور ترکی و ایران میں کھڑی زبر (ـٰ) کو الف ماقبل مفتوح (ـَا) کے برابر سمجھا جاتا ہے یعنی (سمٰ) کو "مَا" ہی پڑھا جاتا ہے لہٰذا اسی طرح صرف کھڑی زبر لکھنا کافی سمجھا جاتا ہے ــ یعنی "الرحمٰن" ہی لکھتے ہیں ــ چین میں اسم جلالت کی طرح اس لفظ پر بھی لمبی ترچھی مد لکھتے ہیں یعنی "الرَّحمٰن" لکھتے ہیں ــ اور جیسا کہ پہلے بحث استعاذہ میں لفظ "مِن" اور "شیطن" کے آخری "نون" کے سلسلے میں بیان ہوا ــ یہاں بھی بیشتر افریقی ممالک میں آخری نون پر نقطہ نہیں ڈالتے یعنی اسے "الرَّحمٰں" ہی لکھتے ہیں ــ اور بعض جگہ آخری نون پر نقطہ ڈالتے بھی ہیں تو "ن" کے "پیٹ" میں نہیں بلکہ دائیں طرف کے (پہلے) سرے پر لکھتے ہیں ــ (یعنی الرحمں)۔

[الرَّحِیْم] میں "حاء" (ح) کے بعد والی "یاء" (ی) پر برصغیر پاک و ہند کے سوا دنیا کے کسی اسلامی ملک میں بھی علامت سکون (ـْ) نہیں ڈالی جاتی ــ سب جگہ اسے (الرَّحِیم) ہی لکھتے ہیں ــ بلکہ ان ملکوں میں "یا" ماقبل مکسور (ـِی) پر کہیں بھی سکون کی علامت نہیں لکھی جاتی۔ صرف "یا" ماقبل مفتوح (ـَی) پر ہی یہ علامت ڈالتے ہیں۔ صرفی نحوی منطق کے اعتبار سے یہ قاعدہ درست ہے۔ تاہم غیر عربی دان ناظرہ خوان کے لئے یہ ضبط بھی ناقص اور باعث التباس ہوسکتا ہے۔ اس لئے برصغیر میں اس "یا" پر علامت سکون ڈال کر (الرَّحِیْم) لکھتے ہیں۔

ایران اور ترکی میں (عرب ملکوں کی طرح) اس "یاء" پر علامتِ سکون تو نہیں ڈالتے مگر "حاء" کے نیچے عام کسرہ (ـِـ) کی بجائے علامتِ اِشباع والی کھڑی زیر (ـٖـ) ڈال کر (الرَّحِیم) لکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں:-

بِسْمِ - بِسْمِ - بِسْمِ - بِسْمِ

اللّٰہِ - اَللّٰہِ - اِللّٰہِ - اِللّٰہِ - اَللّٰہِ

الرَّحْمٰنِ - الرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ - اَلرَّحْمٰنِ -

اَلرَّحْمٰنِ - الرَّحْمٰنِ -

الرَّحِیْمِ - الرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ - اَلرَّحِیْمِ -

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حرف "میم" جو "بسم اللہ" ہی میں تین جگہ آیا ہے، کو کُتّابِ مصحف (خصوصاً افریقی ممالک میں) اس طرح لکھتے ہیں کہ اس کے سر کے کو اندر سے ہمیشہ خالی لکھتے ہیں۔ (م ، سم) اس کی وجہ ایک حدیثِ نبویؐ ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے ایک کاتبِ وحی کو فرمایا تھا "لَا تُعَوِّرِ الْمِیْمَ" "کہ میم کو اس کی آنکھ مٹا کر نہ لکھو" یعنی "م - سم" کو "م یا سم" نہ لکھو۔ یہ ہدایت "بسم اللہ" کی کتابت کے بارے میں مروی ہے تاہم اس کو قرآن کریم کی کتابت میں ہر جگہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ البتہ برصغیر ترکی اور ایران میں اس کی ہر جگہ پابندی نہیں کیجاتی۔

(جاری ہے)

حضرت صدیق اکبرؓ غیروں کی نظر میں

صاحب صدر اور حاضرین بس

میرے لئے اس محفل میں شرکت بلاشبہ باعثِ سعادت ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرۃ اس قدر پاکیزہ، دل کش اور بے عیب ہے کہ اغیار نے بھی ان کی عظمتِ ذاتی کا اعتراف کیا ہے اور بصمیمِ قلب انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

(۱) میں سب سے پہلے ہندوؤں کے مہاتما اور محسن اعظم مسٹر گاندھی کی رائے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں گا۔ جب ۱۹۳۷ء میں ملاعنہ فرنگ نے ہند کے باشندوں کو صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی تو گاندھی نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو قوم کو ۷۴۰ سال کے بعد (۱۲۰۷ تا ۱۹۴۷) آزادی ملنے والی ہے چونکہ وہ اس طویل مدّت میں حکمرانی کے طور طریقے فراموش کر چکے ہیں اس لئے میں ان کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ 'ہجرتِ' ابو بکرؓ اور 'ہجرتِ' عمرؓ کے "اسوۂ حسنہ" کو پیش نظر رکھیں۔ کیونکہ تاریخ عالم ان سے بہتر حکمران ابھی تک ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکی ہے۔ یہ مشورہ دینے کے بعد گاندھی نے دونوں بزرگوں کی پاکیزہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا تھا اور صدیق اکبرؓ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اس قدر درویش صفت تھے کہ خلیفہ بن جانے کے بعد بھی عوام کی سیوا اسی طرح کرتے تھے جس طرح پہلے کرتے تھے۔

(۲) اس کے بعد عیسائی مصنّفین کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

فان کریمر (VON KRAMER) اپنی تالیف 'THE ORIENT UNDER THE CALIPHS' میں لکھتا ہے:-

"مدینے کے نواح میں بمقام "سنح" نہایت سادگی سے رہتے تھے اور خلیفہ ہو جانے کے بعد سات ماہ تک روزانہ صبح کو ایسے وقت مدینے پہنچ جاتے تھے کہ مومنوں کو فجر کی نماز پڑھا

سکیں۔ مدینے منتقل ہو جانے کے بعد بھی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف ایک خادم تھا جو گھر کا کام کرتا تھا اور بوقتِ فرصت مجاہدین کی تلواروں کو صاف کرتا تھا۔"

(۳) ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) :-

" روح اسلام کا مجسمہ ظاہری آنحضرتؐ نہیں تھے بلکہ آپ کے جگری دوست اور معاون حضرت ابو بکرؓ تھے۔ اگر آنحضرتؐ ابتدائی اسلام کا ذہن اور تخیل تھے تو ابو بکرؓ اس کا ضمیر اور ارادہ تھے۔ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کی رفاقت میں بسر ہوئی مگر اس طرح کہ محمدؐ نے جو بات بھی زبان سے نکالی ابو بکرؓ نے اس پر آمنّا اور صدّقنا کہا۔

محمدؐ کی وفات کے بعد ابو بکرؓ نے اُس ایمان کا مظاہرہ کیا جس کی بدولت پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ۶۲۸ء میں شاہانِ عالم کو اسلام کی دعوت دی تھی ابو بکرؓ نے اپنے آقا کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور اگر دنیائے اسلام میں ابو بکرؓ کے پائے کے بیس آدمی اور ہوتے تو وہ ساری دنیا کو فتح کر لیتے۔"

(۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام :-

" حضرت ابو بکرؓ کی سب سے بڑی خصوصیت وہ غیر متزلزل ایمان ہے جو وہ آنحضرتؐ کی رسالت پر رکھتے تھے۔ معراج اور صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے ایمان کی جس پختگی کا مظاہرہ انہوں نے کیا اس کے صلے میں بقول ابن اسحاق انہیں الصدّیق کا لقب حاصل ہوا اور یہ لقب آج تک ان کے نام کا جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔

نہایت رقیق القلب اور حلیم الطبع تھے جب تلاوت کرتے تھے تو رقت طاری ہو جاتی تھی اور بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ جب آنحضرتؐ نے ان سے کہا کہ تم ہجرت میں میرے رفیقِ سفر ہو گے تو فرطِ مسرت سے گریہ طاری ہو گیا۔ پیغمبر کی اخلاقی تعلیم کا ان پر بہت جلد اثر مرتب ہوتا تھا جس کا ثبوت مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے سے مل سکتا ہے۔

ابو بکرؓ دین کی ترقی کے لئے ہمیشہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔ جب اسلام لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن بوقت ہجرت صرف ۵ ہزار رہ گئے تھے اور چلتے وقت انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ابو بکرؓ نے قبول اسلام کے بعد ہجرت تک ہر نازک موقع پر اپنے آقا کا ساتھ دیا۔ ہر مصیبت کا رسولؐ کے ساتھ شانہ بشانہ مردانہ وار مقابلہ کیا ان کی دنیاوی زندگی میں سب سے اعلیٰ مقام اس وقت آیا جب محمدؐ نے

انہیں اپنا رفیق منتخب کیا اور اللہ نے ان کی ایثار آمیز رفاقت کو "ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ" کے لقب سے اسلام کی تاریخ میں غیر فانی بنا دیا۔

پیغمبر نے ۹ھ میں انہیں امیر الحج کا شرف عطا کیا اور میری تحقیق کے مطابق انہوں نے اعلانِ برأۃ لوگوں کو سنایا تھا نہ کہ حضرت علیؓ نے۔ جب محمدؐ بیمار ہوئے تو انہوں نے ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اور اسی نمایاں خصوصیت کی بناء پر عمرؓ اور ان کے احباب (مثلاً ابن عوفؓ، ابن جراحؓ، ابن ابی وقاصؓ، طلحہؓ وغیرہ) نے سقیفہ میں ابو بکرؓ کو خلیفۃ المسلمین منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

چونکہ دین میں وہ کسی بدعت کے قائل نہیں تھے اور ان کی سیرت نہایت مستقیم تھی اس لئے وہ ثانی یا مجسم محمدؐ بن گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی وفات کے وقت اُمّت کو ایسی مستحکم حالت میں چھوڑا کہ اس نے عمرؓ کے زمانے میں ان کی حکومت کو سہارا دیا۔ ابو بکرؓ نے اطاعت رسولؐ کا بہترین نمونہ اس وقت پیش کیا جب انہوں نے نازک حالات کے باوجود جیشِ اُسامہؓ کو روانہ کر دیا۔ ابو بکرؓ نے بنو حنیفہ کو مغلوب کر کے اور مطیع اسلام کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جو ان کے آقا بھی انجام نہیں دے سکے تھے۔

خلیفہ ہو کر بھی ابو بکرؓ نے اپنی سادگی کو برقرار رکھا۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ابو بکرؓ نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ مدنظر رکھا کہ سب مومن برابر کے حصہ دار ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں ان کی سادگی اور ان کے زہد و اتقاء کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے عہدے سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور مالدار ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی"[1]

(۵) اسٹینلی لین پول 'STUDIES IN A MOSQUE' میں لکھتا ہے:
"ابو بکرؓ کی سنجیدہ قوت فیصلہ اور محبت و شفقت سے لبریز دل یہ دو خوبیاں اسلام کی ترقی کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں"۔

---

[1] ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وظائفِ سابقون لاحقون سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا سبقت الی الاسلام سے میں بھی واقف ہوں مگر یہ تو وہ چیز ہے جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ یہاں اس دنیا میں تو معاش کا معاملہ ہے اور اس میں سابق اور لاحق سب برابر ہیں لہٰذا یکسانیت ترجیح سے بہتر ہے۔

(۶) سائمن اوکلے 'HISTORY OF SARACENS' میں لکھتا ہے:۔
"ابو بکرؓ نے بیت المال میں کبھی رقم جمع نہیں ہونے دی۔ ہر جمعہ کو نماز سے قبل جس قدر رقم ہوتی تھی سب مستحق افراد میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی صفات عفت و عصمت، زہد و ورع اور زخارفِ دنیوی سے بے تعلقی قابل تقلید تھیں۔ قبل وفات انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جس قدر رقم میں نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین بیت المال سے لی ہے سب میرے ذاتی اثاثے کو فروخت کر کے واپس کر دو۔ چنانچہ جب عمرؓ نے یہ بات سنی تو کہا "ابو بکرؓ نے اپنے جانشین کے سامنے نہایت دشوار نمونہ پیش کیا ہے۔"

(۷) ایڈورڈ گبن لکھتا ہے جب ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جدّی جائیداد کا گوشوارہ مرتب کر لو تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ابو بکرؓ نے بیت المال میں ناجائز تصرف کر کے جائیداد میں اضافہ کر لیا ہے۔ وہ صرف تین درہم روزانہ اپنے خانگی اخراجات کے لئے لیتے تھے۔ صرف ایک اونٹ اور ایک حبشی غلام ان کی ملکیت تھا اس کے باوجود ہر جمعہ کو وہ زائد پس ماندہ رقم اور بیت المال کی ساری رقم خیرات کر دیتے تھے۔ جب ان کی وفات کے بعد ان کا کل ترکہ جو ایک موٹے کرتے اور چادر اور پانچ درہم پر مشتمل تھا، عمرؓ کے حوالے کیا گیا تو انہوں نے آہِ سرد بھر کر کہا "میں اُن کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا"۔

(۸) ڈاکٹر وائل 'A HISTORY OF THE ISLAMIC PEOPLES' میں لکھتا ہے:
"ابو بکرؓ کی نجی زندگی بھی اسی طرح پاکیزہ اور اعتراضات سے بالاتر تھی جس طرح ان کی پبلک زندگی۔ اس کے سوا ان پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی کہ وہ خالدؓ پر غیر معمولی طور سے مہربان تھے مگر یہ طرزِ عمل بھی ان کی سیاسی حکمت عملی اور دانش مندی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے مال غنیمت ہمیشہ صرف سلطنت کی بہبود پر خرچ کیا۔ خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا وہ خلیفہ ہو کر بھی اسی طرح غریب رہے جس طرح پہلے تھے (وہ اپنی ساری دولت اسلام پر قربان کر چکے تھے) انہوں نے صحابہؓ کے اصرار شدید پر چند ہزار درہم سالانہ بطور وظیفہ قبول کیا تھا وہ مہربان، سادگی پسند اور بہت متورع تھے"۔

(۹) اندرے سروئیر 'ISLAM AND THE PSYCHOLOGY OF THE MUSALMANS' میں لکھتا ہے:
"ابو بکرؓ بہت سادگی پسند تھے اور خلیفہ بن جانے کے باوجود انہوں نے غربت کی زندگی بسر

ی جب وفات پائی تو ترکے میں صرف ایک بوسیدہ قمیص ایک غلام اور ایک اونٹ چھوڑا۔ وہ حقیقی معنی میں اپنی قوم کے شیخ اور سردار تھے۔ اہل مدینہ کے محبوب تھے۔ ایک خوبی ان میں سب خوبیوں پر بھاری تھی اور وہ سخت جفاکشی تھی۔ ان کی فتوحات کا سرچشمہ وہ دو صفات تھیں جو ان کے دشمنوں میں نہیں تھیں۔ ایک تو ایمان باللہ جسے کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی تھی دوسری اسلام کی حقانیت پر پختہ یقین۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ صحیح مقام پر صحیح آدمی تھے انہوں نے محمدؐ کے نام کو از سر نو شروع کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔"

(۱۰) سر ولیم میور لکھتا ہے :۔

"جب ابو بکرؓ بستر مرگ پر تھے تو ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی کہ بیت المال سے بقدر ضرورت وظیفہ بھی کیوں لیا؟ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ میری فلاں جائیداد بیچ کر وظیفے کی کل رقم بیت المال میں واپس کر دی جائے۔

سیرت کے اعتبار سے ابو بکرؓ نہایت رقیق القلب اور شریف النفس تھے اسی رقتِ قلبی کی بنا پر ان کا لقب الاوّاہ پڑ گیا تھا یعنی بہت زیادہ آہ بھرنے والا۔ انہوں نے ساری عمر کسی پر ظلم نہیں کیا۔ دن میں معاملاتِ خلافت انجام دیتے تھے۔ رات کو غریبوں اور مسکینوں کی خفیہ طور پر خدمت کرتے تھے۔ ایک رات حضرت عمرؓ مدینے کی ایک ضعیف اور نابینا بیوہ کی خدمت کے لئے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابو بکرؓ ان سے پہلے پہنچ کر ان کی خدمت میں مشغول ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ابو بکرؓ بہت نرم دل تھے مگر ضرورت کے وقت نہایت مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے تھے۔ مثلاً سب نے منع کیا مگر انہوں نے جیشِ اُسامہؓ کو روانہ کر کے ہی دم لیا حالانکہ اس وقت مدینے میں فوج کی اشد ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ کی اطاعت کا جذبہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے سب صحابہؓ سے کہہ دیا کہ جس علم کو آنحضرتؐ نے لہرا دیا میں اس کو ہرگز نہیں لپیٹوں گا۔

ابو بکرؓ کو استعلائے نفس کا مطلق خیال نہ تھا اگرچہ وہ مطلق العنان تھے مگر انہوں نے اپنے اقتدار کو اسلام کی بہبود کے لئے استعمال کیا۔ لیکن ان کی غیر معمولی قوت کا راز محمدؐ پر ایمان میں مضمر تھا۔ ان کے سامنے ہمیشہ ایک ہی مسئلہ رہتا تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے میں جو اس وقت میرے سامنے ہے اگر آنحضرتؐ ہوتے تو کیا کرتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس اصول

سے وہ بال برابر اِدھر یا اُدھر نہیں ہوئے۔ اسی جذبے کی بدولت وہ فتنہ ارتداد کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور اسلام کی بنیادوں کو دوبارہ مستحکم کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ ان کا عہدِ حکومت بہت مختصر تھا مگر پیغمبر کے بعد، دینِ اسلام اپنی بقا کے لئے ان سے زیادہ کسی شخص کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔

ان کا محمدؐ پر ایسا پختہ ایمان خود محمدؐ کے خلوص پر زبردست شہادت ہے۔ اگر محمدؐ نے اپنی نبوت کا آغاز فریب سے کیا ہوتا تو وہ اس شخص (یعنی ابو بکرؓ) کی حمایت اور دوستی اور رفاقت حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جو انتہائی دانش منداور زیرک ہی نہیں تھا بلکہ جس نے اپنی ساری زندگی ایمانداری، خلوص اور سادگی میں بسر کر دی ہے"

(THE CALIPHATE BY W. MUIR P 78 - 81)

(۱۱) انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا جلد اول صفحہ ۶۹ :-

"چونکہ ابو بکرؓ کا ایمان محمدؐ کی رسالت پر نہایت پختہ اور مستحکم تھا اس لئے انہیں الصِدّیق کا لقب حاصل ہو گیا۔ رسولؐ سے شخصی تعلق میں انہوں نے انتہائی فدویت اور سچی عقیدت کا ثبوت دیا ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ بوقت ہجرت صرف وہی رفیق پیغمبر تھے اور رفاقت کا یہ شرف انہیں پیغمبر کی وفات تک مسلسل حاصل رہا۔

بحالت مرض الموت پیغمبرؐ نے ابو بکرؓ کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم دے کر دراصل اس طرف اشارہ کر دیا کہ میری وفات کے بعد وہی میرے جانشین ہوں گے۔ پیغمبرؐ کے اس انتخاب کی تصدیق تمام اکابر صحابہؓ نے کر دی پھر انجام کار اس انتخاب کو مستقل حیثیت دے دی اگرچہ حضرت علیؓ نے شروع میں اختلاف کیا تھا مگر پھر سر تسلیم خم کر دیا"۔

بقیہ: کاروانِ حدیث

32۔ ابن سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص 173
33۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج 2 ص 210
34۔ نووی، شرح صحیح مسلم مقدمہ نووی ص 15
35۔ نووی شرح صحیح مسلم مقدمہ نووی ص 13،
36۔ شبیر احمد عثمانی، مقدمہ فتح الملہم ص 9
37۔ سید صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء ص 48

(جاری ہے)

(۱۲)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

اسلامی ریاست اور آزادیٔ فرد کا تحفظ

سطور بالا میں وضاحت کے مطابق چونکہ صرف ایک اسلامی ریاست ہی فرد میں صحیح نصبُ العین سے محبّت کے تقاضوں کو پُورا کرنے اور اس میں افزونی کی ضمانت دے سکتی ہے، اس لیے اسی تناسب سے وہ فرد کی آزادی اور اس کے زیادہ سے زیادہ ذہنی و روحانی ترفّع کا اہتمام کرتی ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کی صحیح نصب العین سے محبّت کو جبراً اور زبردستی پروان نہیں چڑھایا جاسکتا۔ اسلامی ریاست کی مشینری ہر ممکنہ کوشش سے ایک مسلمان فرد میں صحیح نصب العین سے تعلق خاطر اور حبّ الٰہی میں بالیدگی کا باعث بنتی ہے۔ اور جوں جوں وہ اس میں کامیاب ہوتی ہے، فرد میں اپنی ذمّہ داری اور آزادی کا احساس اسی قدر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غلط اور ناپسندیدہ نصب العین سے تعلق کا باعث فرد پر کوئی نہ کوئی قدغن بنتی ہے، یعنی فرد پر داخلی یا خارجی دباؤ اور تحدیدات سے اس میں غلط اہداف سے محبّت و تعلق بصرف پیدا ہوتا ہے بلکہ اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا ہے۔

خلیے اور نامیاتی وجود کا ربط و تعلّق

اگر ہم پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے بارے میں تشبیہ پر غور کریں تو ہم پر ایک فرد اور اجتماعی نظم یعنی ریاست کے مابین ربط و تعلق سمجھنا آسان ہو

جاتا ہے۔ آپؐ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کی مثال ایک فردِ واحد کی کیفیت سے دی ہے۔ وہ جوشِ حیات جو ایک نامیاتی وجود کو زندہ اور برقرار رکھتا ہے، دماغ اور مرکزی عصبی نظام کے ذریعے پورے جسم تک پہنچتا ہے اور جسم کے ہر خلیے کو توانائی بہم پہنچاتا ہے۔ مجموعی طور پر جسم کی صحت و قوت کا انحصار اسی جوشِ حیات پر ہوتا ہے۔ جب کسی نامیاتی وجود کا ایک خلیہ مطلوبہ حد تک توانائی حاصل کر لیتا ہے تو مرکزی عصبی نظام کے ذریعے وہ زائد توانائی دوسرے خلیوں کو منتقل کر دیتا ہے۔ گویا اس طرح ایک خلیہ اپنی 'زکوٰۃ' ادا کرتا ہے۔ ایک خلیہ دوسرے خلیوں کو توانائی دے کر پورے جسم کی قوت و صحت کا باعث بنتا ہے اور مضبوط و توانا جسم دوبارہ انفرادی طور پر ہر خلیے کی مزید قوت کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ خلیے اور جسم کے درمیان دو طرفہ ربط و تعلق ہے: خلیہ نہ صرف جسم کو قوت دیتا ہے، اس سے لیتا بھی ہے۔ اسی طرح جسم خلیے کو توانائی دیتا بھی ہے اور اس سے لیتا بھی ہے۔

ریاست اور فرد کا باہمی تعلق

اُوپر دی گئی مثال سے ایک فرد اور اجتماعیت کا باہمی تعلق بھی بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح حیاتیاتی سطح پر جوشِ حیات ایک نامیاتی جسم کو نہ صرف وجود میں لاتا ہے بلکہ اسے برقرار بھی رکھتا ہے، اسی طرح نفسیاتی سطح پر وہ ایک اجتماعیت، منظم سوسائٹی اور ریاست کو وجود بخشتا اور اس کے تسلسل کا باعث بنتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں اس کی کیفیت نصب العین سے محبت کی ہوتی ہے۔ وہ ریاست جو اپنے شہریوں میں نصب العین سے محبت زیادہ سے زیادہ درجے میں پیدا کرتی ہے، خود بھی اسی تناسب سے مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ریاست میں حکومت کو وہی اہمیت حاصل ہوتی ہے جو جاندار جسم میں دماغ اور عصبی نظام کی ہوتی ہے۔ جس طرح اس میں دماغ مرکزِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح حکومت کسی ریاست میں محبت و وابستگی کا مرکز ہوتی ہے اور حکومت کی تشکیل اس اجتماعیت میں نصب العین سے سب سے زیادہ عشق و محبت رکھنے والے لوگ کرتے ہیں۔ جس طرح ایک جاندار وجود کے ذہن سے خون کی شریانوں کے ذریعے جوشِ حیات جسم کے تمام حصوں میں پہنچتا ہے تاکہ وہ زندہ و قائم رہے اسی طرح ریاست کی لیڈر شپ میں موجود نصب العینی محبت نظامِ تعلیم اور دیگر ذرائع کے ذریعے تمام

افرادِ مملکت تک منتقل ہوتی ہے۔ اور یہی چیز ایک نظریاتی ریاست کی بقا اور ترقی کا باعث بنتی ہے۔ جب حکومت کی مہیا کردہ تعلیمی سہولتوں سے ایک فرد کی نصب العین کے ساتھ محبت بڑھتی ہے تو اس سے پوری قوم کا فائدہ ہوتا ہے۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک ذمہ دار فرد اپنی صلاحیتوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود میں استعمال کرتا ہے اور دوسروں میں بھی خود آگہی اور علم و عرفان کے حصول کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ عقلی و نفسیاتی سطح پر ایک فرد کا اپنے معاشرے اور بھائی بندوں کے لیے ایسا کرنا ایک قسم کی ادائیگی زکوٰۃ ہے۔ اسلامی ریاست کی حکومت ایسے مواقع بہم پہنچاتی ہے کہ ایک فرد اپنے علم کو دوسروں تک بسہولت منتقل کر سکے اور یہی چیز اس ریاست کی نہ صرف تقویت کا باعث بنتی ہے بلکہ اس کے وجود کی غرض و غایت بھی اسی صورت میں پوری ہوتی ہے اور اسی لیے اسلامی ریاست میں وہی لوگ زمام کار سنبھالتے ہیں جو راست آدرش سے اعلیٰ ترین محبت رکھتے ہوں اور خود آگہی کی صفت سے متصف ہوں۔ اور پھر یہ ذمہ دار افراد ریاست کے دوسرے لوگوں میں ان اقدار کے نفوذ کی سعی بھرپور طور پر کرتے ہیں۔ خاص طور پر یہ افراد ملک کے نظامِ تعلیم کو خارجی اور اندرونی دونوں جانب سے کنٹرول کرنے اور اسے صحیح رُخ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ افراد اور ریاست کے عام لوگ مل جُل کر ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں اور ریاست میں صحیح نصب العین سے محبت و تعلق پروان چڑھتا ہے۔

ریاست اور فرد باہم ایک گہرے رشتے میں منسلک ہیں اور ایک دوسرے کے لیے سامانِ زیست بہم پہنچاتے ہیں۔ ریاست کا وجود اور اس کی نظریاتی شناخت افراد پر منحصر ہے اور دوسری طرف افرادِ ریاستی معاشرے اور اجتماعی نظم کے تعاون کے بغیر ترفع اور کمال حاصل نہیں کر سکتے۔ فرد کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت شدہ صلاحیتوں کو نمایاں کرنے اور بروئے کار لانے کے لیے اجتماعیت سے مربوط ہو۔ جب کوئی فرد صرف اپنے انفرادی مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور اجتماعی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے صرف ذاتی احتیاجات کو خود غرضی کے ساتھ پورا کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے تو صحیح نصب العین سے اس کا قلبی تعلق کمزور پڑنے لگتا ہے اور اس کی انفرادی ترقی میں بھی کجی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکیداً حکم دیا ہے کہ ایک مومن مشکلات کے باوجود اور اپنی خود پسند خواہشات کے علی الرغم جماعت کے ساتھ جڑا رہے اور اس کے ساتھ ہر ممکن

تعاون کرے :

علیکم بالجماعۃ مَن شَذَّ شُذَّ فی النَّار ۔

"تم پر فرض ہے کہ تم جماعت کے ساتھ رہو۔ جو کوئی جماعت سے کٹتا ہے آگ میں جھونکا جاتا ہے۔"

ارتقاء کے لیے اسلام کی اجتماعیت پر تاکید

مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نماز جیسی عبادت بھی نہایت منظم اور مرتب انداز میں باجماعت ایک ایسے قائد کے پیچھے پڑھے جو علم اور نصب العینی عشق و محبت میں سب سے بہتر ہو۔ نماز میں وہ کلمات کی ادائیگی اور حرکات و سکنات میں ایک خاص قاعدے قرینے کی سختی سے پابندی کرتا ہے باجماعت نماز کی ایک غرض و غایت یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے تئیں ایسی اجتماعیت کا رکن تصور کرے جس کا ایک نظریۂ حیات اور مقصد تاسیس ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ جائے کہ وہ اپنے مقصد حیات کو بھی صرف اجتماعی نظم سے وابستہ ہو کر حاصل کر سکتا ہے۔ نماز باجماعت گویا اس کی پوری زندگی کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ نماز کی پابند حرکات و سکنات اور امام کی اقتدا سے اس کے ذہن و قلب میں یہ حقیقت راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ حسن ازلی سے تعلق اور نصب العینی محبت کا کمال صرف جماعت کے ساتھ منسلک رہ کر حاصل کر سکتا ہے۔

ایک امام کی اقتدا میں نماز باجماعت کا نقشہ درحقیقت ایک مسلمان کی پوری زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے جملہ امور کو مسلمانوں میں سب سے زیادہ بہتر اور متقی لیڈر کے تحت منظم ہو کر انجام دینے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو شخص سیاسی و سماجی امور کا سربراہ ہوتا ہے وہی نماز باجماعت میں امامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام میں دینی اور دنیوی امور کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ اسی چیز کی اہمیت نمایاں کرنے کے لیے قرآن میں جا بجا باجماعت نماز اور قیامِ نظامِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے :

وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (البقرۃ : ۴۳)

"اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔"

اللہ کے حضور دعا مانگتے ہوئے بھی ایک مسلمان صرف اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ پوری مسلمان

اجتماعیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ان الفاظ میں دعا کرتے ہوئے جمع کے صیغے کو استعمال کرتا ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً
وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (البقرۃ: ۲۰۱)

اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خیر و خوبی سے نواز اور عذاب جہنم سے بچا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۝ (البقرۃ: ۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار بھول چوک اور خطا و غلطی پر ہماری پکڑ نہ کر۔

ایک مسلمان ریاست کے یہاں کون اداروں کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ تمام ایک مسلمان شہری اور اجتماعی زندگی کے لیے آسانی اور تقویت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے اپنے محلے کی مسجد میں جائے اور لوگوں سے ملاقات کرے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے اسے محلے کی مسجد کے بجائے شہر کی بڑی مسجد یعنی جامع مسجد میں جانا ہوتا ہے جہاں وہ کثیر تعداد میں شہر کے مسلمان بھائیوں سے ملتا ہے پھر عیدین کے اجتماعات اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں جو شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں منعقد ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں اسے شہر بھر کی مسلمان آبادی سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ اس سے آگے سالانہ حج بیت اللہ کے موقع پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا بین الاقوامی سطح پر میل جول ہوتا ہے۔ ذوالحجہ کے مہینے میں حرمین اور عرفات اور منیٰ کے میدانوں میں دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے مسلمان ایک دوسرے سے ملتے اور باہم متعارف ہوتے ہیں۔ اسلام کی تمام عبادات چاہے وہ نماز ہو یا روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی ہو یا حج بیت اللہ، باطنی و روحانی اہمیت کے علاوہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ تمام عبادات ایک مسلمان کو روحانی بالیدگی فراہم کرنے کے علاوہ مسلمانوں کے آپس کے تعلقات میں گرمجوشی اور محبت و اخوت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ جوں جوں ایک مسلمان کا اجتماعی شعور بڑھتا ہے اور وہ معاشرے سے مثبت بنیادوں پر جڑتا ہے، اس کا نصب العین سے تعلق بڑھتا ہے اور اس

میں گہرائی اور گیرائی سے ترقی کرتی ہے اور نصب العین سے اس کی محبت جس قدر بڑھتی ہے وہ مسلمان معاشرے کی ترقی وحدت اور استقلال کے لیے مزید کام کرتا ہے۔

اطاعتِ امیر کی تاکید

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی زندگی پر بے انتہا زور دیا ہے۔ یہ تاکید اس تعلیم سے بھی نکلتی ہے جو آپؐ نے نماز باجماعت میں امام کی اقتدا کے لیے دی ہے۔ امام کی تھوڑی بہت غلطی کے باوجود مقتدیوں پر لازم ہے کہ وہ امام کے پیچھے چلیں۔ امام کی غلطی کا وبال خود اس پر ہوگا لیکن نماز میں مقتدیوں کے لیے اجازت نہیں کہ وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں۔ معلوم ہوا کہ نماز جیسی اہم عبادت میں بھی چھوٹی موٹی غلطی کو اہمیت نہ دیتے ہوئے نظمِ جماعت کا خیال بہرحال ضروری ہے۔ معمولی اور غیر اہم اختلاف سے پر جماعت کا ساتھ چھوڑ دینا انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔

"تم پر جماعت سے وابستگی لازم ہے۔ جو جماعت سے کٹا، آگ میں جھونکا گیا۔"

ایک مسلمان کے جماعت سے علیحدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوری اجتماعیت کو خطرے میں ڈالتا ہے اور اس طرح مسلمان ریاست کی کارکردگی بحیثیتِ مجموعی متاثر ہوتی ہے چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مردِ مومن خود اپنے دینی و دنیوی فائدے کے لیے اجتماعیت کی قوت و استحکام کا ہر دم متمنی رہتا ہے، کیونکہ اجتماعیت کا شیرازہ بکھرنے سے خود اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ رسولِ خدا کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی بات سنی جائے اور اطاعت کی جائے خواہ وہ ایک سیاہ فام حبشی غلام ہو۔ ایک اور اہم حدیث رسولؐ کا متن کچھ اس طرح ہے: "جب تم ایک امیر کی اطاعت پر اتفاق کر لو۔ تو پھر اگر کوئی شخص اس اجتماعیت میں رخنہ ڈالے اور تمہاری اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کرے، تو تمہیں اسے تہ تیغ کر دینا چاہیے۔"

اس جگہ پیغمبرِ اسلامؐ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کی مثال ایک زندہ جسم کی صورت میں دے کر مسئلے کی کیفیت مزید واضح کر دی ہے۔ جب ایک فرد کوئی غلط کام انجام دیتا ہے تو اس کے

[illegible] انجام دہی [illegible] ہوتا کہ اعضاء وجوارح [illegible] کر لیا ہو [illegible] یا غلطی کی تلافی [illegible] اپنے مالک کا [illegible] فاعل اپنا وجود کھو دے گا اور مستقل [illegible] اپنے تمام [illegible] کی تکمیل میں مکمل طور پر ناکام رہے گا۔ اسی طرح ہماری [illegible] فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جماعت کے ساتھ رہیں، الا یہ کہ جماعت کی اکثریت یا امیر صریحاً غلط راستے پر چل نکلے۔ جس طرح ایک مسلمان اپنی زندگی کی تاریخ کبھی کبھار غیر اخلاقی کام یا گناہ ومعصیت میں غیر شعوری طور پر مبتلا ہونے کے باوجود صحیح رُخ پر رہتا ہے، اسی طرح مسلم اجتماعیت عموی غلطیوں کے باوجود اپنے مقصدِ اعلیٰ کی طرف ہی پیش قدمی کرتی ہے بشرطیکہ اس میں اتحاد ویکانگت کی صحیح رُوح کارفرما ہو۔ تاہم یہ امر مسلّم ہے کہ اسلام نے امارت میں تبدیلی یا بہتری کے لیے پُرامن ذرائع اور آئینی اقدامات کا سہارا لینے کی اجازت دی ہے۔ اسلام جدید عمرانی تقاضوں کے ساتھ بخوبی چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مسلمان اپنی اجتماعیت کو یکجا رکھتے ہوئے بھی جدید سیاسی اور آئینی اقدامات کے ذریعے حکومت کے سربراہ کو بدل سکتے ہیں۔ البتہ اسلام اس بات کی تاکید ضرور کرتا ہے کہ مسلمان باہم جنگ وجدال یا انتشار کا شکار نہ ہوں۔

صحیح نصب العین کے مطابق عالمگیر ریاست کا ظہور ناگزیر ہے

سطور بالا میں دی گئی تصریحات سے ظاہر ہے کہ صحیح نصب العین پر مشتمل ایک مثالی ریاست کی حدود میں وسعت کی بے پناہ صلاحیت ہے، حتیٰ کہ یہ پوری دنیا پر محیط ہوسکتی ہے۔ تمام باطل نظریات رفتہ رفتہ اس کے مقابلے کی تاب نہ لاکر ختم ہو جائیں گے اور صرف اسلام کا حقانی نظریہ ہی عالمگیر ریاست کی صورت میں متشکل ہوگا۔ اسلامی ریاست کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے دین کی اطاعت ہوگی، لہٰذا اس کے افراد بھی باہمی طور پر اسی دینی جذبے کے حوالے سے مربوط ہوں گے اور پوری اُمتِ مسلمہ ایک جسد کی طرح ہوگی۔ صرف توحید پر مبنی صحیح نصب العین سے محبت ہی اختلافات کو ختم کر کے عالمگیر سطح پر لوگوں کو متحد کرسکتی ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۳۲)

"چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ (کی پھونکوں سے) اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کیے اپنی روشنی کے اور خواہ کافروں کو (کتنا ہی) ناگوار گزرے"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۳۳، الصّف: ۹)

"اسی نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے پوری جنسِ دین پر اور خواہ مشرکوں کو (کیسا ہی) ناگوار گزرے"

صحیح نصب العین کی فتح اور علوم

راست اور صحیح نصب العین کی باطل نظریات پر آخری فتح طبیعی علوم بالخصوص طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کے علوم میں ترقی سے قریب سے قریب آتی چلی جائے گی، کیونکہ ان علوم میں ترقی اور وسعت سے انسان آفاق و انفس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مطالعہ بڑے پیمانے پر کر سکے گا۔ وہ اس طرح نہ صرف خارج میں مادی کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کرے گا، بلکہ نفسیاتی علوم میں ترقی سے اپنے باطن اور نفس کے حقائق کی معرفت بھی حاصل کر سکے گا۔ ان علوم اور قوانین پر دسترس انسان کو اس درجے حاصل ہو جائے گی کہ وہ قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا نظر آئے گا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (حٰمٓ السجدۃ: ۵۳)

"ہم انہیں عنقریب آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ یہ حقیقت ان پر کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) حق ہے"

(جاری ہے)

تنقیح وتوضیح

محمد سعید الرحمٰن علوی

اہل السُّنّۃ والجماعۃ

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ ' اپنی معروف کتاب " حجۃ اللہ البالغہ " میں " فرقہ ناجیہ " (آخرت میں نجات پانے والا فرقہ) کے متعلق فرماتے ہیں :

" میں کہتا ہوں فرقہ ناجیہ وہ ہے جو عقیدہ اور عمل میں ظاہر کتاب (قرآن مجید) اور سنت (پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کا طریق) پر کاربند ہے۔ جملہ صحابہ (علیہم الرضوان) اور تابعین (رحمہم اللہ تعالیٰ) اسی راستے پر چلے ہیں..... برخلاف اس کے غیر ناجی فرقے (آخرت میں نجات سے محروم رہنے والے فرقے) وہ ہیں جنہوں نے سلف صالحین کے عقیدہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا عقیدہ تراش لیا ہے یا ان کا عمل اُن کے عمل کے مخالف ہے۔ "

(اردو ترجمہ جلد دوم ص 60 - 61 مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور)

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ دنیا میں جب سے اسلام کا ظہور ہوا ' اس وقت سے تین طبقات موجود رہے اور آج تک موجود ہیں..... ایک طبقہ اُن خوش قسمت افراد کا ہے جو عقیدہ وعمل ' اخلاق وعادات اور معاش ومعاشرت میں اسلام کی ہدایات کو دل وجان سے تسلیم کرتا اور ان پر عمل کرتا ہے..... یہی طبقہ قرآن کے الفاظ میں مومن ومسلم ہے۔

دوسرا طبقہ ان افراد کا ہے جنہوں نے پیغمبرانہ تعلیم کو جھٹلایا ' انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ کفر وانکار کی روش اختیار کی۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا..... قرآن ایسے ہی افراد کو " کافر " کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو قرآن کے الفاظ میں مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (النساء۔ 143) ہے یعنی

(اقرار وانکار) دونوں کے درمیان اُدھ میں لٹکتے ہیں ' نہ اُن میں نہ اِن میں ' ایسے طبقہ

کو قرآن عزیز نے "منافق" کہا اور جا بجا ان کا ذکر کیا۔ اور بعض مقامات پر بہت ہی سخت انداز میں اس طبقہ کا ذکر کیا..... کیونکہ یہ طبقہ اپنے مفادات کے لئے دین اسلام کا نام لیتا ہے' جب کوئی ظاہری فائدہ نظر آتا ہے' تو جھٹ ایمان کا دعویٰ کر کے "جماعتِ مسلمین" سے وابستگی کا اعلان کر دیتا ہے اور جب پریشانی اور دکھ کی گھڑیاں آتی ہیں تو پھر الگ تھلگ ہو کر غریب مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتا ہے..... اس طبقہ کی موٹی موٹی نشانیاں قرآن و حدیث میں یہ ہیں۔

○ ..... صحابہ کرام علیہم الرضوان (اور مخلص مسلمانوں) کو بے وقوف قرار دینا۔ (البقرہ۔ 13)

○ ..... نماز میں غفلت و سستی کرنا اور یاد الٰہی کا اہتمام نہ کرنا اور جو کرنا بھی تو وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے۔ (النساء۔ 142)

○ ..... مسلمان جماعت کو غریبی کا طعنہ دینا اور یہ باور کرانا کہ گویا ہم انہیں کھانے کو نہ دیں گے تو وہ اسلام چھوڑ دیں گے۔ (المنافقون۔ ۸)

○ ..... جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔

○ ..... جس وقت بات کرے (تو) جھوٹ بولے۔

○ ..... جب وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے۔

○ ..... جب لڑے تو گالیاں دے۔ (بخاری۔ مسلم)

یہ طبقہ ایسا ہے کہ اس سے بہت ہی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ حضور اقدس امام الانبیاء خاتم الرسل و المعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"سید (سردار) وغیرہ جیسا کوئی احترام کا لفظ کسی منافق کے لئے نہ کہو کہ اس سے تم اللہ تعالیٰ کو ناراض کر لو گے۔" (رواہ ابو داؤد)

ان تینوں **طبقات** میں سے دوسرا طبقہ تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں..... وہ بلاشبہ غیر ناجی (نجات سے محروم) جماعت اور طبقہ ہے' جبکہ تیسرا طبقہ ایسا ہے کہ اگر اس کی منافقت کا تعلق عقیدہ سے ہے تو وہ بلاشبہ دوسرے طبقہ کی طرح ہے..... قرآن عزیز میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (النساء۔ 140)

"بے شک خدا سارے منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرے گا۔"

قرآن عزیز نے اسی سورہ کی آیت 139 میں اس طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وہ (ایسے لوگ ہیں کہ) مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا وہ اُن (کافروں) کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ تو عزت ساری خدا ہی کے پاس ہے۔"

اور آیت 141 میں ارشاد فرمایا:

"وہ منافق تمہیں تاکتے رہتے ہیں، پھر اگر تمہیں خدا کی طرف سے فتح ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور جو کافروں کی قسمت یاور ہوتی ہے (انہیں وقتی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے) تو اُن سے کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تمہیں نہ گھیر لیا تھا اور مسلمانوں سے نہ بچا لیا تھا؟"

الغرض..... یہ ہے منافقوں کا کردار، جس کا ذکر قرآن کے حوالہ سے سامنے آیا..... ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اچھا انجام کیسے حاصل کر سکیں گے؟

ہاں یہ بات ہے کہ اگر اس کا نفاق و منافقت عملی ہے..... تو بھی اس کی بدبختی بہت زیادہ ہے، وہ معاشرے کا ناسور ہے، رستا ہوا زخم ہے۔ کلنک کا ٹیکہ ہے اور باعثِ نفرت۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

"منافق کی مثال اس بکری کی طرح ہے جو دو گلوں (ریوڑوں) کے درمیان گھومتی (پھرتی) ہے، کبھی اس گلے کی طرف آنا چاہتی ہے اور کبھی اُس گلے کی طرف (جانا چاہتی ہے)۔" (عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ مسلم)

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ طبقات جو عقیدے، عمل اور کردار کے اعتبار سے غلط راستے پر جا رہے ہیں جو اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں، جو اپنی بے راہ روی تسلیم نہیں کرتے..... بلکہ ع

کس نہ گوید کہ دوغِ من تُرش است (کوئی نہیں کہتا کہ میرا دہی کھٹا ہے)

کے مصداق، اس گمان کا شکار ہیں کہ وہ ہی کامیاب ہیں اور ہر جگہ اور ہر موڑ پر کامیابی ان کا ہی حصہ ہے..... دنیا میں جو جتنا بے راہ روی کا شکار ہے وہ اتنا ہی زیادہ کامیابی کا مدعی ہے..... بہت سے طبقات جو کسی نہ کسی طرح اسلام کا نام لیتے ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا دعوے دار ہے کہ بس کامیابی کا سہرا اسی کے سر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے ارشادات میں واضح کیا کہ حقیقی نجات اور کامیابی اس کا مقدر ہے جو راہ راست پر چلنے والا ہے، صراط مستقیم پر عمل پیرا ہے، میری اتباع کرنے والا ہے

اور میری سنت پر قائم ہے..... ایک مشہور حدیث میں پہلی امتوں' بالخصوص یہود اور نصاریٰ کی فرقہ بازی کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان میں 72'72 فرقے پیدا ہو گئے میری امت میں 73 ہوں گے۔ اور یہ سب کے سب ناری اور دوزخی ہوں گے سوائے ایک طبقہ اور فرقہ کے..... اور وہ ایسا ہو گا جو میرے اور میرے صحابہ کے راستہ پر چلنے والا ہو گا۔ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنّۃ)

اس لئے یہ لازم ٹھہرا کہ اس کامیاب اور فلاح و فوز پانے والے طبقہ کی نشاندہی کی جائے اور بتلایا جائے کہ وہ کون خوش قسمت اور خوش نصیب ہوں گے' کامیابی جن کے قدم چومے گی!

مشکوۃ کے حوالہ سے جس حدیث پاک کا مفہوم اوپر ابھی بیان ہوا اسی کی روشنی میں اہل نظر اور صاحب بصیرت علماء نے یہ واضح کیا کہ کامیاب طبقہ "اہل سنت و جماعت" ہے۔

لیکن ستم یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت یا دوسرے لفظوں میں "سنی" کہتا ہے اور اس طرح کامیابیوں کا اپنے آپ کو اجارہ دار سمجھتا ہے۔

تو ہماری اصل ضرورت یہ ہے کہ "اہل سنت و جماعت" کی وضاحت کی جائے کہ یہ کون ہیں؟ سو سمجھنا چاہئے کہ "اہل سنت و جماعت" میں سے دو لفظوں "سنت" اور "جماعت" کی وضاحت کے بغیر مسئلہ سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس عنوان کا سیدھا سادا معنی ہے..... "سنت اور جماعت والے"۔

سوال یہ ہے کہ سنت اور جماعت والے کون ہیں؟

اس سوال کا جواب جب ہی ممکن ہے کہ سنت اور جماعت کے دو الفاظ کی تحقیق کی جائے تو ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان الفاظ کا مفہوم اپنے قارئین کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ پہلے "سنت" کی طرف آئیں۔

یاد رکھیں کہ لفظ "سنت" کے معنی علماء نے یہ لکھے ہیں۔ طریقہ' نہج' سیرت' راستہ وغیرہ۔

اصولی طور پر ہر اچھے اور برے طریقہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج 11 ص 392)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے ایک ارشاد میں اچھے اور برے دونوں ہی راستوں کے لئے یہ لفظ آیا ہے..... حدیث کا ترجمہ ہے:

"جس نے اسلام میں ایک اچھا طریقہ رائج کیا اور اس کے بعد اس پر عمل ہوا تو اس

کے لئے ان تمام لوگوں جیسا اجر (وثواب) لکھا جائے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے اجروں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی' اور جس نے اسلام میں برا طریقہ رائج کیا اور اس کے بعد اس پر عمل ہوا تو اس پر ان تمام لوگوں جیسا گناہ لکھا جائے گا جنہوں نے اس پر عمل کیا اور ان کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔"
(مسلم۔ کتاب العلم)

حدیث پاک میں "سُنَّةً حَسَنَةً" اور "سُنَّةً سَيِّئَةً" کے الفاظ آئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ "اچھے برے دونوں ہی راستوں" کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مقامات پر آیا ہے جس میں ٹھیک ٹھیک یہی معنی سامنے آتا ہے یعنی "طریقہ" مثلاً سورۃ الانفال میں ہے:

"اور اگر وہ (کافر) پھر (ظلم وقتال کی طرف) لوٹیں گے تو بے شک پچھلوں کا طور طریقہ پڑ چکا ہے۔" (آیت۔ 38)

اس قسم کی لگ بھگ 8 آیات کی علماء نے نشاندہی کی ہے جس میں یہ لفظ ایسے ہی معانی میں مستعمل ہوا ہے بعض آیات میں یہ لفظ "قانونِ الٰہی" کے معنی میں آیا ہے جیسے سورۃ الاحزاب میں ہے:

"یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے ان (پیغمبروں) کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم مقرر ٹھہرایا ہوا ہے۔"

اور قرآن کریم کی بعض آیات ایسی ہیں جن میں "سنّت" جمع کے صیغہ "سنن" کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی یہ لفظ متعدد مواقع پر انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے..... ایک حدیث جو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کی اس میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین مبغوض ترین افراد کا ذکر کیا جن میں سے ایک وہ ہے:

مُبْتَغٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ

"جو شخص اسلام میں دورِ جاہلیت کے رسم ورواج چاہتا ہو (وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی مبغوض ہے)۔"

"اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں لکھا کہ "چند مستثنیٰ مقامات کو چھوڑ کر حدیث میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اس سے مراد "سنتِ رسول" (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق) ہی ہے" (ج 11 ص 394)

حدیث پاک کی 14 بنیادی کتابوں کی عظیم الشان فہرست "المعجم المفہرس" کی دوسری جلد میں صفحات 552 اور 555 سے 558 تک میں ان تمام روایات کی تفصیل ہے

جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے..... ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے بھی اقوال ہیں۔ جو اس بات کی بہت ہی اہم دلیل ہے کہ "سنت" سے مراد پیغمبر اقدس کا طریقہ ہے۔

اہل علم کی مستند کتابوں میں سنت کے تین معانی میں پہلا معنی ہے:

"عقائد و اعمال کا وہ نظام جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتلایا اور ان پر عمل فرمایا..... آپ کے بعد خلفاء راشدین علیہم الرضوان اور امت مسلمہ کی اکثریت اس پر قائم رہی۔" (دائرۃ المعارف ج 11 ص 395)

اسی کے مقابل بدعت آتی ہے جس کے متعلق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (النسائی)

"دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

اس مرحلہ پر یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بعض لوگ کم علمی یا دانستہ طور پر غلط فہمی پھیلانے کی غرض سے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ آج دنیا میں لاتعداد چیزیں نئی ہیں جنہیں ہم استعمال کرتے اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ کھلا ہوا دھوکہ اور فریب ہے جو "بدعت پسند طبائع" عام لوگوں کو دے کر بدعت کو رواج دینا چاہتے ہیں اوپر کے حوالہ میں جو الفاظ آئے کہ "عقائد و اعمال کا وہ نظام"..... تو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایسی چیز گمراہی کا سبب ہے جو دین کے حوالہ سے ہو..... مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان کا ایک مخصوص طریقہ رائج تھا..... اب یار لوگوں نے اس سے پہلے یا بعد میں یا درمیان میں مختلف طریقوں سے مختلف اضافے کر لئے یا زمانہ رسالت اور دور خیر القرون میں نماز جنازہ کے بعد فوری طور پر دعا کا ثبوت نہیں' اب اس کو دین کا حصہ بنالیا گیا ہے اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ "دین اسلام کے نظام عقائد و اعمال" میں گڑبڑ اور ردوبدل کا نام بدعت ہے اور بعض شکلوں میں اس سے بھی بڑھ کر..... یعنی کفر یا شرک!

"نظام عقائد و اعمال" میں گڑبڑ کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا' اس پر ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیں..... حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (مسلم)

اس حدیث مبارکہ میں "فی امرنا هذا" ٹھیک ٹھیک نظام عقائد و اعمال کی ترجمانی ہے..... اور اسی سنت پر عمل کرنے والے اور قائم رہنے والوں کو "اہل السنۃ" کہا گیا ہے۔ (مسند دارمی ص 40)

اور اسی سنت سے خروج کو جماعت (اسلام و مسلمین) سے خروج کہا گیا۔ (مسند احمد بن حنبل ج2 ص229)

یاد رہے کہ محقق علماء نے سنت کے تین معانی بیان کئے ہیں۔ 1..... سنت بمقابلہ بدعت' (جس کا ذکر اوپر تفصیل سے ہوا)

2..... سنت بمعنی اقوال و افعال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

3..... سنت' وہ احکام جن پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا عمل رہا۔

(الموافقات للشاطبی)

صحابہ کرام علیہم الرضوان کے معاملہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ (ترمذی)

"جس راستہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں"۔

ایک اور حدیث ہے:

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ (ابوداؤد)

"تم پر میرے اور خلفاء راشدین کے راستہ و طریقہ کی پیروی لازم ہے"۔

اس لئے سنت کے مفہوم میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے فیصلے بھی شامل ہیں..... اور انہی کے نام لیواؤں کا نام "اہل السنّتہ" ہے۔

"سنت" کا مفہوم واضح کرنے کے بعد "جماعت" کی بحث آتی ہے کہ الجماعۃ سے مراد کیا ہے؟

علماء نے جماعت کے معنی لکھے ہیں "اکٹھا کرنا' اتفاق کرنا' متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا' موافقت کرنا' متفرق اور بکھری چیزوں کو یکجا کر دینا" (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج7۔ ص363)

پھر علماء کہتے ہیں کہ لفظ جماعت کا استعمال عام ہے..... صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ جماعۃ الشجر' جماعۃ النبات۔

اس لفظ کا مادہ "ج۔م۔ع" قرآن عزیز میں متعدد بار استعمال ہوا ہے..... البتہ لفظ الجماعۃ یا جماعۃ قرآن عزیز میں نہیں ہے..... احادیث مبارکہ میں اس کا استعمال بہت ہوا ہے..... مثلاً

صلاۃُ الجمعۃ تفضُل صلاۃَ الفذّ (البخاری)

یعنی با جماعت نماز کا ثواب اکیلے نماز پڑھنے سے زیادہ ہے۔

پھر حدیث میں یہ لفظ مسلمانوں کی اس جماعت کے لئے استعمال ہوا ہے جو کسی امام کی اطاعت پر جمع ہوں..... مثلاً

فان لم یکن لھم جماعۃ ولا امام (بخاری۔ مسلم۔ ابن ماجہ)

جب مسلمانوں کی نہ جماعت ہو اور نہ امام (تو انہیں کیا کرنا چاہئے؟)

بعض وثائق جو سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نقل کئے گئے ان میں سیاسی، قانونی اور حکومتی اساس پر قائم تنظیم مسلمین مراد لی گئی..... مثلاً بحرین کے حکمران کو حضورؐ اقدس نے جو گرامی نامہ لکھا اس میں ہے:

"میں تجھے ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں..... اس پروردگار عالم پر تو ایمان لا، اس کی فرماں برداری کر اور الجماعۃ میں داخل ہو جا۔ کہ یہ تیرے حق میں بہت بہتر ہے (کہ انجام بخیر ہو جائے گا)" (الوثائق ص نمبر 9 مطبوعہ قاہرہ 1956ء)

اور ایک حدیث اس معنی میں آئی ہے:

المارق من الدین التارک للجماعۃ (بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد)

"اھل السنّۃ والجماعۃ" کی مخصوص اصطلاح آج جن معنوں میں رائج ہے اس کے متعلق "الفرق الاسلامیۃ" کے فاضل مؤلف کا کہنا ہے کہ یہ بمقابلہ "شیعہ" مستعمل ہے اور اس کو باقاعدہ شکل تیسری صدی ہجری میں حاصل ہوئی۔ یہ دور "عباسی خلیفہ المتوکل" کا تھا۔

"جماعت" کا لفظ اپنے معنوں میں کتنی ہی وسعت رکھتا ہو لیکن بنیادی طور پر اس سے مراد "جماعتِ صحابہ" ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے:

"حضرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرز زندگی اور طریق عمل کو سنت کہتے ہیں جماعت کے لغوی معنی تو گروہ کے ہیں لیکن یہاں جماعت سے مراد جماعتِ صحابہ ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

"اس لفظی تحقیق سے اہل السنّت والجماعت کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس فرقے کا اطلاق ان اشخاص پر ہوتا ہے جن کے اعتقادات، اعمال اور مسائل کا محور پیغمبر علیہ السلام کی سنتِ صحیحہ اور صحابہ کرام کا اثر مبارک ہے۔" **اہلسنت والجماعت ص ۳**

اور مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنے مخصوص اسلوب میں فرماتے ہیں:

"جب آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و مناصب پر قائم ہوئی..... خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہو گئیں..... اختلاف صرف تعدّد و تنوّع ہی کا نہ رہا بلکہ اس اختلاف میں تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔" (مسئلہ خلافت ص 14)

گویا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے..... قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے لفظ "امت" کہا ہے..... اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً.....

امام مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول اس کا صحیح ترجمہ یہی ہے..... مولانا ابوالکلام نے اس کا ترجمہ کیا:

"بے شک ابراہیم اپنی شخصیت میں ایک امت تھے۔"

ان کی دعاؤں کا ثمر، خلاصہ و روحِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گو قرآن میں ایسا لفظ نہیں لیکن آپ کی شخصیت کی جامعیت اور کمالات کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ:

آپؐ اپنی شخصیت میں ایک امت تھے۔

آپ کا وجود باجود امت کے لئے اور جماعت کے لئے ایک مرکز تھا..... اور محور، جس کے گرد پوری جماعت گھومتی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ کا خمیر جو اٹھا تو اسی اجتماع قوی و مناصب سے..... لیکن بعد میں وہ بات نہ رہی۔ سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اور ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں اور یہ اختلاف ایسا نہ تھا کہ اسے گلاب کے مختلف رنگوں کا نام دیا جا سکے۔ بلکہ اس نے ایک تضاد کی شکل اختیار کر لی اس کے بعد جماعت کہاں رہی؟ امت ٹکڑوں میں بٹ گئی..... اس لئے علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح کہا کہ:

"جماعت کے لغوی معنی تو گروہ کے ہیں لیکن یہاں جماعت سے مراد 'جماعت صحابہ' ہے۔"

وجہ ظاہر ہے کہ انہی قدوسیوں کے دور میں صحیح شیرازہ بندی نظر آتی ہے اور تبلیغی جماعت کے امیر ثانی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں "امت بنا" اسی کا نام ہے۔

مشہور مجاہد امام حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی "جماعت" سے "جماعت صحابہ" ہی مراد لی ہے۔

(دیکھیں منہاج السنۃ ج 1 ص 256)

خطیب البغدادی نے بہتر فرقوں والی مشہور حدیث کی بنا پر "اھل السنۃ والجماعۃ" کا معنی لکھا:

الذین ھم ما علیہ ھو و اصحابہ (الفرق بین الفرق ص 20)

یعنی وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے (سنت) اور آپ کے اصحابؓ کے مسلک پر ہیں۔

البغدادی مزید فرماتے ہیں:

"جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس کی ٹھیک ٹھیک صفات کے ساتھ مانتا ہو' حضور اقدس کی نبوت اور ان کے پیغام کو تمام انسانوں کے لئے کافی اور برحق سمجھتا ہو۔ اور یقین رکھتا ہو کہ قرآن احکام شریعت کا سرچشمہ ہے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا فرض ہے اور کسی ایسی بدعت میں ملوث نہ ہو جو کفر کا باعث ہے تو ایسا شخص سنی اور مؤحد ہے۔ یعنی ملت اسلامیہ کے سواد اعظم یا (سب سے بڑی جماعت) اہل السنۃ و الجماعۃ میں شامل ہے۔" (الفرق بین الفرق ص10)

بہرحال لفظ سنت اور جماعت کی اس توضیح و تشریح کے بعد اب رہ جاتا ہے لفظ "اہل" ..... سو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لفظ بغیر مضاف الیہ استعمال نہیں ہوتا اور اس کے معنی "صاحب" "والے" وغیرہ آتے ہیں۔

مثلاً "اہل الرجل" کسی شخص کے متعلقین۔

"اہل الدار" گھر والے۔

اور بھی مختلف حوالوں سے قرآن اور حدیث میں یہ لفظ وارد ہوا ہے لیکن اپنے معانی کے اعتبار سے اصل غرض یہی بنتی ہے اس لئے جب کوئی شخص کہتا ہے:

اھل السنۃ و الجماعۃ

تو وہی بات بنتی ہے جو البغدادی نے کہی کہ:

"حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طریقے اور آپ کے اصحابؓ کے مسلک والے (یعنی ان پر چلنے والے)"

امام ابن تیمیہ اور البغدادی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ گو ایک معروف و متعارف اور مخصوص اصطلاح کے طور پر یہ لفظ تیسری صدی میں مستعمل ہوا لیکن مخصوص حوالوں سے اور عمل و کردار کی رو سے ابتدا ہی سے بات ایسی بن گئی تھی کہ اہل حق اور متبعین سواد اعظم کی حقیقی شناخت ایسے ہی ہوتی تھی کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طریق و منہج پر چلنے والے اور مسلکِ صحابہ کرام پر عمل کرنے والے تھے..... ان کے بالمقابل مختلف جماعتیں اور افراد کے طبقات ایسے تھے جو ان خصائص سے محروم تھے..... مثلاً اس دور کی آج کی طرح ایک جماعت شیعہ حضرات کی تھی جو عقیدۂ توحید سے لے کر عبادات کے ہر پہلو تک اپنا مخصوص تشخص رکھتی تھی۔ وہ "عقیدہ بدء" کے حوالہ سے ذات و صفات باری تعالیٰ کے معاملہ میں اپنی مخصوص سوچ کی حامل تھی تو سیدنا علی اور ان کے خاندان کی وراثتی امامت

کے تصوّر کے سبب ختم نبوت کے بنیادی عقیدہ سے منحرف تھی۔ قرآن اس کے نزدیک نامکمل کتاب تھی تو قرآن کی حفاظت کے لئے سینہ سپر جماعت صحابہ جسے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے براہ راست کسب فیض کا موقع ملا، اس کے نزدیک ناقابل اعتبار ہی نہ تھی بلکہ معاذ اللہ ایمان سے محروم تھی۔ اس کے بعد اذان، نماز، وضو اور ایک ایک چیز میں اس کا مخصوص ذوق و مسلک تھا جس پر وہ آج تک عمل پیرا ہے۔ اور اس کے باوجود بڑی ڈھٹائی سے دین اسلام سے وابستگی کی مدعی ہے..... قومی اور جماعتی تشخص ہر فرد کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر کسی کے پلّے کچھ نہیں رہتا۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ آدمی جھوٹ سچ کی کہانیاں بنا کر اپنی اصلیت کو چھپا کر دنیا کو دھوکہ دے..... آدمی میں اتنی جرأت ہونی چاہئے کہ وہ جو ہے وہ بن کر رہے اور اسی کا اظہار کرے..... ایک ہندو، ایک یہودی اور ایک عیسائی جب اپنے ہندو، یہودی اور عیسائی ہونے پر فخر کرتا ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو "اہل سنت و جماعت" کے "مسلّمات" کو نہ مانتا ہے نہ ان پر عمل کرتا ہے تو پھر وہ اہل سنت و جماعت کیوں کہلاتا ہے..... اسلام ایک دین ہے اس کی ایک حقیقت ہے اس کی ایک تعریف ہے اور جو شخص ان مسلّمات کو مانتا ہو وہ مسلمان ہے..... لیکن ستم ہے کہ کچھ نہ مان کر اور کچھ نہ کر کے بہت سے لوگ "مسلمان" کہلانے پر مصر ہیں اور "سنّت و جماعت" کے مسلّمات کو نظر انداز کر کے ایک شخص اہل سنت و جماعت کہلانے پر مصر ہو..... عجیب المیہ ہے۔

ایک شخص زندگی کے دائروں میں وہی کچھ کہلا سکتا ہے جو وہ ہے..... پٹواری، پٹواری رہ سکتا ہے تو پولیس مین کو اپنی اسی حیثیت پر قناعت کرنا پڑے گی..... ڈاکٹر بلڈنگ کا نقشہ نہیں بنا سکتا تو انجینئر میڈیکل سپیشلسٹ کا بورڈ نہیں لگا سکتا، سائنس کی کسی شاخ میں بھرپور مہارت رکھنے والا پی۔ ایچ۔ ڈی..... کسی چھوٹی سی چھوٹی عدالت میں بطور وکیل نہیں پیش ہو سکتا تو پھر اس مسلّمہ اصول کا اطلاق مسلمان اور سنی پر کیوں نہیں ہوتا؟

یہ نہ بحث کا سوال ہے نہ کٹ حجتی کا، بلکہ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے اور ہر شخص اگر وہی رہے جو وہ ہے اور اس کے علاوہ کچھ کہلانے پر مصر نہ ہو تو جھگڑے کا مطلق امکان نہیں..... اسلام رشتۂ انسانیت کا بے حد احترام کرتا ہے اور انسانی اقدار کی پاسداری کا بھرپور لحاظ کرتا ہے، ہمیں اس کی فکر کرنی چاہئے اور غلط اندازِ فکر سے الگ ہو کر مطمئن اور مسرور زندگی گزارنی چاہئے۔

جزئیات میں جانے کا فائدہ ہے نہ اس کی ضرورت، سنّت کا معاملہ بالکل واضح ہے اس پر عمل پیرا ہی سُنّی ہے اور پروپیگنڈے یا ہنگامہ آرائی سے آج کوئی سنت سے عناد رکھنے والا اور بدعت نواز و بدعت پرست سنی کہلانے بھی لگے اور حقیقی سنّیوں پر کسی اور طرح کی پھبتی کسے، تو

شاید اس جہانِ رنگ و بو میں وقتی طور پر اس کا دامِ فریب چل جائے لیکن کل جب داورِ محشر کی عدالت ہوگی اور تمام حقائق نکھر کر سامنے آئیں گے تو پھر کوئی دھوکہ اور فریب نہ چل سکے گا۔

اس لئے ہماری درخواست ہے ان لوگوں سے جنہیں رب العزت نے سنت پر عمل اور جماعت سے وابستگی نصیب فرمائی ہے کہ وہ اپنے تعارف کے لئے اسی عنوان پر اکتفا کریں اور کسی دوسرے عنوان کو اپنی شناخت کا ذریعہ نہ بنائیں اور جو حضرات اس نعمت سے محروم ہیں وہ سینہ زوری سے اس عنوان کو اپنی شناخت کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اس پر عمل کر کے حقیقی معنوں میں سُنّی بنیں..... اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقت شناس بنائے اور اپنی مرضیات کا پابند بنائے۔

بقیہ: حرفِ اوّل

میں داخلہ دلانے کے خواہشمند ہوں، مناسب ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کو اس ورکشاپ میں ضرور بھیجیں تاکہ مطلوبہ مقصد حاصل کیا جاسکے۔ اسی طرح اُن تمام طلبہ کو بھی جن کے سینے دینی علوم کی آرزو سے آباد ہوں اور وہ قرآن کالج سے متعارف ہونے کی خواہش رکھتے ہوں، اس ورکشاپ میں شرکت کی ابھی سے تیاری کر لینی چاہیے۔ اس لیے کہ اندیشہ ہے کہ اس مبارک آرزو اور تمنّا کو پروان چڑھانے کے اس اہم موقع کو گنوانا کہیں اس آرزو سے ہاتھ دھونے کا باعث نہ بن جائے۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

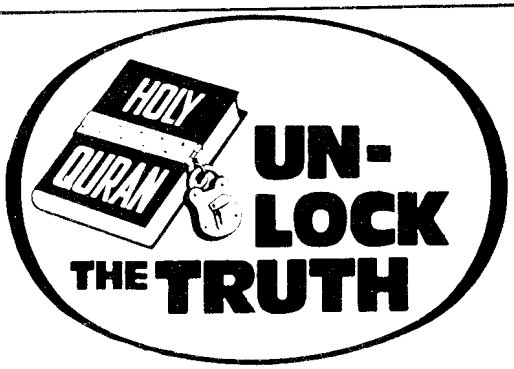

نقطۂ نظر

سیّد عباس علی

اسلام اور تصوّف

حکمتِ قرآن، اگست ۸۸ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک مقالہ بعنوان "اسلام کا نظامِ روحانی" کے مطالعہ سے منکشف ہوا کہ دینِ کامل اسلام کے ساتھ 'طریقت' اور 'تصوّف' کی پیوندکاری کرکے دینِ حق کی وحدت کو دو لخت کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں استاذِ فلسفہ، صوفی، صافی بزرگ حضرت مولانا عبدالباریؒ کے قول سے دلالت کی گئی ہے کہ :-

"جس طرح انسانِ کامل کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اُسی طرح دینِ کامل کے بھی دو رخ ہیں، 'شریعت' و 'طریقت' اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا۔ اُسی طرح طریقت یا تصوّف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا۔"

استاذ فلسفہ مزید فرماتے ہیں کہ :-

"بات یہ ہے کہ کسی شئے کے کمال کا تعلق اُس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان، اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے۔"

صاحبِ مضمون آگے لکھتے ہیں کہ :-

"صورتِ اعمال تو قرآنی اور حدیثی صراحتوں اور حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلم کے نمونۂ اعمال سے ملیں گی جس کا درس ہر عالمِ دین سے مل سکتا ہے۔ البتہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت۔ منجذب ہو کر منتقل ہوتی آرہی ہے، کسی مستند صحبت یافتہ اور مجازِ صحبت بزرگ ہی سے بطریقِ انجذاب حاصل کی جاسکتی ہے۔"

پھر دعویٰ کیا گیا ہے کہ :-

"آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہو تو وہ کسی قاری سے نہیں، معقولی سے نہیں، نرے مولوی سے نہیں بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفی صافی کی صحبتِ بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا۔"

گویا ان دلائل کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ دینِ اسلام میں طریقت یا تصوّف ہی اصل اور حقیقی فعّال ہے اور شریعت محض عضوِ معطّل۔

ان دلائل پر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا فیصلہ سُن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"شریعت کے تین جزو ہیں۔ ۱ علم۔ ۲ عمل اور ۳ اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو ثابت نہ ہو جائیں اُس وقت تک شریعت ثابت نہیں ہوتی۔ اور جب شریعت ثابت ہو گئی تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو گئی جو کہ دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں سے اُوپر ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط۔ (سورۃ التوبہ، ۷۲)

"اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔" پس شریعت تمام دنیوی اور اُخروی سعادتوں کی ضامن ہوئی۔ کوئی بھی مقصد نہیں جس کے حاصل کرنے میں شریعت کے ماسوا کسی اور چیز کی ضرورت پیش آئے۔ طریقت اور حقیقت کہ جس کے ساتھ سوفیائے کرام ممتاز ہیں، شریعت کے تیسرے جزو یعنی 'اخلاص' کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں کے حاصل کرنے سے مقصد شریعت کو کامل کرنا ہے نہ کہ شریعت کے سوا کوئی اور امر ہے ..... طریقت اور حقیقت کی منزلوں کو طے کرنے سے اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہے کہ اخلاص حاصل ہو جائے۔ جو کہ حق تعالےٰ کی رضا حاصل ہونے کے لیے لازمی ہے ..... کم سمجھ لوگ احوال و مواجید (حال و وجد) کو اصلی مقاصد میں سے شمار کرتے ہیں اور مشاہدات و تجلیات کو اصل مطلب خیال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ وہم و خیال کی بندش میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور شریعت کے کمالات سے محروم

رہتے ہیں۔" (مکتوب نمبر ۳۶)

اپنے مکتوب نمبر ۴۰ میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں :۔

"پس طریقت اور حقیقت دونوں شریعت کے جزو 'اخلاص' کو کامل کرتے ہیں، شریعت کے خادم ہیں۔ اصلی مقصد تو یہی ہے مگر ہر شخص کی سمجھ یہاں تک نہیں پہنچتی۔ اکثر اہل دنیا خواب و خیال کے ساتھ مطمئن ہو گئے ہیں اور انہوں نے اخروٹ اور منقی کو کافی سمجھ لیا ہے۔ وہ شریعت کے کمالات کو کیا جانیں اور طریقت اور حقیقت کی اصلیت تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور طریقت کو مغز جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ معاملہ کی حقیقت کیا ہے۔ وہ صوفیوں کی باطل باتوں پر دھوکا کھائے ہوئے ہیں اور احوال و مقامات پر فریفتہ ہیں" (ماخذ۔ "مکتوبات حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا اُردو ترجمہ" مترجم۔ حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ۔ ادارۂ مجدّدیہ ۳۔ ایچ۔ ۲/۵۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۹۸۸ء)

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ السّامی کے مکتوبات کے دلائل و حقائق تو اہل علم حضرات کے لیے طریقت یا تصوّف کے باطل فلسفہ پر حجّتِ محکم کا درجہ رکھتے ہیں لیکن عام قارئین کی غلط فہمیوں کے ازالے اور انکے عقیدے کی اصلاح کے لیے اِس مسئلہ کے فقہی اور تواریخی پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

علاّمہ اقبال فرماتے ہیں :۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست ؛ از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش ؛ در نمی سازد بقرآں محفلش

(ترجمہ :۔ اونی لباس میں ملبوس اپنے خیال میں مست صوفی قوال کے نغمہ کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں ذکر نہیں)

(حکمت قرآن ستمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۶۶)

پروفیسر حافظ احمد یار صاحب اپنے مقالہ " اسلام کا روحانی نظام " (مطبوعہ حکمتِ قرآن دسمبر ۱۹۸۵ء - صـ۱۷) میں لکھتے ہیں۔

" صوفیہ نے بھی روحانی تزکیہ کے لیے جو قواعد اور اصول بیان کئے ہیں انکی اصل قرآن کریم اور اس کا بیان سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ اور جس نام نہاد تصوّف کی بنیاد اور اساس قرآن و سنت نہیں وہ تصوّف نہیں گمراہی ہے .... قرآن مجید کی بیسیوں آیات اسی روحانی نظام کے کسی نہ کسی پہلو (ASPECT) سے تعلق رکھتی ہیں — ہم اُن موضوعات یا عنوانات کی طرف یہاں اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نمبر۱ ذکر اللہ نمبر۲ حب اللہ نمبر۳ خشیۃ اللہ نمبر۴ استغفار نمبر۵ التوبہ الی اللہ نمبر۶ شکر نمبر۷ صبر نمبر۸ توکل نمبر۹ اخلاصِ نیت نمبر۱۰ دعا۔

پروفیسر اختر الحسن کھٹی اپنے مقالہ " تصوّف بحیثیتِ مذہبی واردات " (مطبوعہ حکمتِ قرآن - جولائی ۱۹۸۸ء - صـ۴۹) میں لکھتے ہیں۔

" میں نے آپ حضرات کے سامنے آل عمران کی آیت نمبر۱۶۴ کی تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا۔ اِس میں تزکیہ کا ذکر آیا ہے۔ تزکیہ سے مراد انسان کے ظاہر اور باطن کو پاک کرنا ہے "

پروفیسر اپنے مقالہ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" اگر تزکیۂ نفس اِس نیت سے ہو کہ عباد الرحمٰن کی مدد سے ایک مثالی معاشرہ قائم کر کے عالمی سطح پر دینِ اسلام کو غالب کرنے کی جدّوجہد کی جائے تو یہ کام انتہائی درجہ میں مستحسن ہے۔ اور اگر مقصود محض انفرادی طور پر صوفیانہ اشغال کے ذریعہ اپنے ہم نفسوں پر برتری حاصل کرنا اور اپنی انا کی تسکین ہو تو یہی کام مذموم ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبال)

جناب محمد یعقوب صاحب اپنے مقالہ "مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اسلامی انقلاب کی برکات" (مطبوعہ میثاق اگست ۱۹۸۸ء صفحہ ۷۵) کے ذیلی عنوان 'دینی حالت' کے تحت تصوّف پر اپنا تجزیہ یوں پیش کرتے ہیں۔

"دوسری طرف تصوّف کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی 'عیاں راچہ بیاں' کے مصداق سب پر کھلا ہے۔ 'تہذیب الاخلاق' اور 'مکارم اخلاق' جو تصوّف کا اصل ہدف ہے زیبِ طاقِ نسیان ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر زور شیخ پرستی، قبر پرستی، میلوں ٹھیلوں اور عُرسوں پر ہے۔ چند خدا ترس مشائخ کو چھوڑ کر اکثریت دوکانداری کر رہی ہے۔ عوام کو مختلف توہمات میں مبتلا کر کے شرک و بدعت اور غیر اسلامی شعار کا پرچار ہو رہا ہے۔ تعویذ گنڈوں، جھاڑ پھونک اور شفاعتِ باطلہ کے نام پر غریب جاہل عوام کا استحصال روز افزوں ہے۔"

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دینِ اسلام کی اساس قرآن و سنّت ہے اور قرآن و سنّت ہی ظاہری و باطنی تزکیہ کا سرچشمہ ہیں۔ دینِ اسلام اللہ تعالےٰ کا پسندیدہ دین ہے جس کے نافذ ہیں ہادیٔ اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جن کی حیاتِ طیبہ ہی میں دین مکمل ہو چکا تھا۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"

ترجمہ "آج کے دِن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا۔" (المائدہ: ۳)

اب غور طلب بات یہ ہے کہ جس دن اللہ تعالےٰ نے دین کامل کر دیا اُسوقت طریقت اور تصوّف کا کہیں وجود تک نہ تھا۔ طریقت اور تصوّف کی اصطلاح نہ تو قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے اور نہ ہی احادیث میں۔ حد تو یہ ہے کہ تصوّف عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا صحیح مخرج اور مفہوم آج تک کسی کو معلوم ہے۔ تصوّف کی بنیاد پڑی دوسری صدی ہجری میں۔ پروفیسر اختر احسن بھٹی اپنے مقالہ "تصوّف بحیثیت مذہبی روایات" (مطبوعہ حکمت قرآن۔ جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ ۵۰) میں لکھتے ہیں۔

"امام قشیری اپنے مشہور رسالہ میں لکھتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود تک صحابہؓ کے لقب کے سوا کوئی اور لقب ایجاد نہیں ہوا تھا ..... صحابہؓ کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا لقب پیدا ہوا۔ یہ زمانہ بھی ہو چکا تو بزرگانِ دین زاہد اور عابد کے لقب سے ممتاز ہوئے ..... جو لوگ خاص اہل سنّت والجماعت میں سے زاہد اور اہلِ دل تھے وہ صوفی کہلائے۔ سب سے پہلے جس شخص کو صوفی کا لقب ملا وہ ابوہاشم صوفی تھے۔ جنہوں نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔"

یہی وجہ ہے کہ فلسفۂ تصوّف کا تاج محل تعمیر کرنے والے حضرات محض اپنے اسلاف اور بزرگانِ سلسلہ کے اقوال ہی پر تصوّف کا سارا تانا بانا بُنتے آتے ہیں اور روحانی طور پر اپنا سلسلہ حضرت علیؓ سے جوڑتے ہیں۔ خلفائے راشدین یا صحابہ کرام کے کسی قول سے اپنی حجّت پیش نہیں کرتے۔

جب تصوّف اور دینِ اسلام کے وجود میں ڈیڑھ سو سال کا بُعد پایا جاتا ہے تو عقلِ انسانی یہ کیسے تسلیم کرلے کہ طریقت یا تصوّف شریعت کا حقیقی جزو لاینفک ہے۔ اور اہل ایمان کے باطنی (قلبی) تزکیہ، اصلاح و فوز و فلاح کا تنہا ضامن۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

متذکرہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کے ساتھ طریقت یا تصوّف کی پیوندکاری ۱۵۰ھ کے بعد کی گئی اور اسلامی تواریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اسلام دشمن عناصر، یہود، عیسائی اور مجوسی تصوّف کا لبادہ زیب تن کرکے صوفیہ کرام کے حلقوں میں داخل ہوئے اور موضوع حدیثیں گھڑ گھڑ کر اوّل تو مسلمانوں کے ایمان اور عقیدے کو لبگاڑا اور آخر کار انہیں عمل سے غافل اور جذبۂ جہاد سے فارغ کرکے چھوڑا۔ بقول جناب محمد یعقوب صاحب آج تصوّف ہر نوع کی واہیات اور خرافات کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے (الا ماشاء اللہ) اور بلند بانگ دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی پرچارک اور امّت کے نجات دہندہ ہم ہیں۔

زیر بحث مقالہ میں ایک بہت بڑا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مقالہ نگار صفحہ نمبر ۲۰ پر لکھتے ہیں:۔

وہ بے نظیر اور بے مثل انسان ـــــ کی ہدایت کے لیے قرآن پاک اتارا گیا جو فرقان ہے کہ حق کو حق باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے جو نور ہے کہ راہ آخرت کو روشن کرتا ہے۔ جو شفا ہے کہ نفس کے روگ کو دور کر کے اسکے ذائقہ کو درست کرتا ہے اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفت حق کے قابل بنا دیتا ہے، جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت سے بدل دیتا ہے، جو ھدی ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولا سے ملا دیتا ہے۔

قرآن پاک کے ان ایمان افروز حقائق کو بیان کرنے کے بعد نسخہ کیمیا مان کر پھر فلسفہ تصوف کے مفروضہ عقائد پر ایمان رکھنا اور اسکی ہمنوائی اور تبلیغ کرنا کھلا خلط ضدین ہے۔ فقط

محمد عباس علی
ناظم آباد۔ کراچی

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاهور کو

قرآن کالج کے لیے پرنسپل

کی ضرورت ہے، تفصیلات کے لیے رجوع فرمائیں:

قرآن اکیڈمی، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: (۸۵۶۰۰۴ــــ۸۵۶۰۰۳)

سات روزہ بین الاقوامی مسلم تربیتی کیمپ

تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے زیر اہتمام مسلم خاندانوں کے لیے

ایک دعوتی و تربیتی کیمپ ۲۰ تا ۲۶ اگست ۱۹۸۹ء

ریاست مشی گن میں ڈیٹرائٹ (DETROIT) شہر کے نواح میں ملفورڈ (MILFORD) کے مقام پر منعقد ہو رہا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کیمپ کے مرکزی مقرر اور مہمانِ خصوصی ہونگے۔

کیمپ کا موضوع

"اسلامی طریقِ حیات اور بحیثیتِ مسلمان ہماری ذمہ داریاں"

(ISLAMIC WAY OF LIFE AND OUR OBLIGATIONS AS MUSLIMS)

ہوگا۔ موضوع کی مناسبت سے لیکچرز، ورکشاپس اور سوال و جواب کی نشستوں کے علاوہ دینی دلچسپی کے دوسرے پروگراموں کا اہتمام کیا جائے گا۔ بچوں اور عورتوں کے لیے خصوصی پروگرام تشکیل دیئے گئے ہیں۔

کیمپ میں پاکستان، بھارت، مشرقِ وسطیٰ، یورپ، کینیڈا اور امریکہ سے احباب کی شرکت متوقع ہے۔ جگہ محدود ہونے کے باعث شرکت کے خواہشمند حضرات سے درخواست ہے کہ وہ منسلکہ رجسٹریشن فارم جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ ۳۰ جون کے بعد موصول ہونیوالے فارم قبول نہیں کیے جائیں گے۔ رجسٹریشن فیس اور دیگر اخراجات بڑوں کیلئے -/۱۱۰ امریکی ڈالر، طلباء کیلئے -/۷۵ امریکی ڈالر اور ۵ سے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کیلئے -/۵۵ امریکی ڈالر ہونگے۔ ۵ سال سے کم عمر کے بچے مفت شامل ہو سکیں گے۔ فارم داخلہ رجسٹریشن فیس کے ہمراہ جناب رشید احمد لودھی کو بھجوائے جائیں جن کا ایڈریس فارم پر درج ہے۔ مزید معلومات کے لیے بھی ان سے رجوع کیا جائے۔

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

——— ڈاکٹر اسرار احمد ———

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اشاعتِ خاص	(اعلیٰ سفید کاغذ مجلد)	-/۲۰ روپے
اشاعتِ عام	(نیوز پرنٹ غیر مجلد)	-/۸ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

JUNE [illegible] Regd No. L. No. 8[illegible]

MONTHLY
HIKMAT-E-QURAN
LAHORE
VOL. 8

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ